نقشِ علیمی

جناب علیم احمد صدیقی صاحب مرحوم کے دینی وادبی نگارشات

مقدمہ

حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی صاحب

ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

زیر نگرانی

محترمہ ناہید انوار اللہ صدیقی صاحبہ

بیگم علیم احمد صدیقی صاحب

مرتب

یوسف عظیم صدیقی

نقشِ علیمی

مرتب

یوسف عظیم صدیقی

siddiqiya@yahoo.com

ایڈیشن	:	اول
سنِ اشاعت	:	۲۰۰۶ء
صفحات	:	۱۹۲
قیمت	:	۱۵۰/روپے

کمپیوٹر کتابت/سرِ ورق/طباعت

نیوٹیریک پرنٹرس، کیمپ، پونہ، مہاراشٹر (انڈیا)

Tel: 0091-20-65242427 Mobile: 0091-9423011737

E-mail: neotericprinters@rediffmail.com

نعتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

جبرئیل امیں سے یہ خبر سب کو ملی ہے
خاکی ہے مگر نور کے پیکر میں ڈھلی ہے
عرش کے مہماں کی یہ تکریم یہ توقیر
ذرات سے افلاک تک منزل بھی ملی ہے
اوصافِ حمیدہ کا سلیقہ و قرینہ
کیا فطرتِ عظمٰی میرے آقا کو ملی ہے

خوش بختیِ حسنین کا یہ ذکر و بیان ہے
ورثے میں انہیں نانا کی فطرت بھی ملی ہے
انگلی کے اشارے سے کیئے چاند کے ٹکڑے
کیا قوت و شوکت میرے شاہا کو ملی ہے
درجات میں جن کا نہ مماثل نہ مقابل
آیاتِ قرآنی سے سند ہم کو ملی ہے

آزاد ہیں افکار سے عقبیٰ و جہاں کے
توفیق جنہیں انکی غلامی کو ملی ہے
تعریف ہو توصیف ہو یا ذکرِ نبی ہو
وسعت کہاں الفاظ و معانی کو ملی ہے
شیعانِ علیؑ ہوں یا ثنا خوان محمد ﷺ
صلی علی نورِ نبی سب نے پڑھی ہے

عناوین	صفحہ نمبر
انتساب	

حیاتِ علیمؒ

قلمِ علیمؒ

دینی

تاریخی رسوانح

سیاسی وسماجی

ادبی

خطوطِ اردو نیوز

دعوتی

مزاحیہ

نقد

مکاتیبِ علیمؒ

دینی

دعوتی واصلاحی

ادبی

یادِ علیمؒ

علمائے کرام اور ادباء

اہلِ خانہ اور اقرباء

دہلی اور جدہ کی یادیں

جناب غلام احمد فرقت کاکوروی مرحوم

کے نام

جنکی آج بھی متعدد کتابیں اور ادبی تخلیقات منظر عام پر نہ آسکیں۔
انکے ناقدانہ اور مزاحیہ انداز کو یاد کر کے میں یہ کتاب انکو منتسب
کرتا ہوں۔

مرتبِ کتاب

مقدمہ

محمد رابع حسنی ندوی

ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين و خاتم النبيين محمد، و على آله و صحبه اجمعين، و بعد:

آزادئ ہند سے پہلے لکھنؤ کوئی بہت بڑا شہر نہیں تھا، لیکن یوپی کے بڑے شہروں میں ہونے، نیز تاریخی حیثیت سے اپنا خصوصی مقام رکھنے اور موجودہ عہد میں صوبہ کے مرکزی مقام کی حیثیت رکھنے کی وجہ سے اہمیت کا مالک شہر سمجھا گیا، اس شہر کی سب سے بڑی خصوصیت یہاں کا تہذیبی رکھ رکھاؤ اور اردو زبان کا اپنا ایک اسٹائل، اور معاشرتی آداب کا خصوصی لحاظ رہا ہے، جس کی وجہ سے لکھنؤ کے رہنے والے لکھنؤ سے جانے کے بعد بھی لکھنؤ سے ایک ربط وتعلق برابر محسوس کرتے رہے ہیں۔ سابق دور میں شہر کھلا ہوا اور شائستہ انداز کا بھی محسوس کیا جاتا تھا، اہل علم واہل ادب یہاں ایک انسیت محسوس کرتے تھے۔

اسی زمانہ کی بات ہے کہ ڈاکٹر عظیم احمد صدیقی جو شہر کے ایک اچھے معالج تھے اور شہر میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، ان کے صاحبزادے علیم احمد صدیقی نے لکھنؤ کے اسی ماحول میں نشوونما پائی، وہ اپنے تہذیبی طرز وانداز اور اپنے ادبی ذوق کے ساتھ پہچانے گئے۔ ان کی طبیعت میں ادب نوازی اور شعری ذوق رچا بسا تھا۔

تقسیم ہند کے بعد لکھنؤ میں باہر سے جوق در جوق آمد ہوئی، اس کی وجہ سے اس کی مذکورہ بالا خصوصیات پر خاصی تبدیلی کا اثر پڑا، پھر حالات کے تقاضے سے لکھنؤ کے لوگوں میں جن کو باہر جانے کی آسانی ہوئی انہوں نے زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کی بنا پر باہر جانا شروع کیا۔ ان میں ہمارے علیم احمد صدیقی صاحب بھی تھے، ان کو جدہ جانے کا موقع ملا، وہ لکھنؤ سے جدہ گئے، لیکن اپنے علمی وادبی ذوق کو بھی ساتھ لیتے گئے، پھر وہاں پہونچے ہوئے دیگر لکھنوی افراد کے میل جول سے انہوں نے اپنی ادبی خصوصیات کو قائم رکھا، وہاں بتدریج خلیج اور سعودیہ کے دیگر شہروں کی طرح اردو کے شیدائی ہم وطنوں کی ایک تعداد اکٹھا ہوگئی، اور ۲۵۔۳۰ سال کی مدت میں وہاں اردو کی ایک طرح کی سوسائٹی وجود میں آگئی، اس میں ہم ذوق اکٹھا ہوتے اور شعری وادبی نشستیں بھی ہوتیں۔ اس کا سلسلہ ابھی تک برابر جاری ہے، بلکہ دن بہ دن اس میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ ان میں علیم احمد صدیقی اپنی خصوصیت اپنائے ہوئے شریک ہوتے رہے۔

علیم احمد صدیقی کی خصوصیت صرف یہی نہیں تھی کہ وہ شعر وادب اور لکھنؤ کا انداز زبان و اسلوب اپنائے ہوئے تھے، انہوں نے اپنے والد بلکہ اپنے اجداد سے دین سے ربط و تعلق کی خصوصیت بھی ورثہ میں پائی تھی، اور لکھنؤ کے جن اہل دین سے لکھنؤ کے قیام کے زمانہ ہی سے تعلق ہوا تھا وہ بھی انہوں نے برقرار رکھا۔ راقم الحروف کو بھی ان سے تعلق کا شرف حاصل رہا، اور وہ محبت وکرم فرمائی فرماتے رہے، میری وہاں حاضری یا ان کی لکھنؤ آمد پر ان سے انس و تعلق کا تبادلہ ہوتا تھا۔ ان سے مل کر خوشی ہوتی تھی، اس تعلق کو ان کے نونہال صاحبزادے عزیزی یوسف عظیم صدیقی سلمہ اللہ نے بھی قائم رکھا، جو ابھی ماشاء اللہ طالب علم ہی ہیں وہ اپنے والد مرحوم سے میرے تعلق کی بنا پر مجھ سے مانوس بھی ہیں، عزیز موصوف کے اندر تعلیم میں ترقی اور توجہ کے ساتھ ساتھ دینی مزاج اور رجحان سے خاصی وابستگی پائی جاتی ہے، نیز انہوں نے اردو زبان وادب سے تعلق اپنے والد

سے ورثہ میں پایا ہے۔

مقدر کی بات کہ جناب علیم احمد صدیقی صاحب کو بلاوا ان کے مالک کی طرف سے جلد آ گیا، یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ اتنی جلدی ہم لوگوں سے جدا ہو جائیں گے۔ لیکن بہرحال اس مرحلہ سے تو سب ہی کو گزرنا ہے، آدمی چلا جاتا ہے مگر اس کی یادیں باقی رہتی ہیں۔ جناب علیم احمد صدیقی مرحوم کی یادوں کا حصہ زبان وقلم کا عطا کردہ بھی ہے، ان کے صاحبزادے عزیزی یوسف صدیقی کو یہ قلمی یادیں دیکھ کر خیال پیدا ہوا کہ ان کے تعارف کے ساتھ ان کو اکٹھا کر دیا جائے۔ اس سے قارئین محظوظ بھی ہوں گے اور یہ اہل تعلق کے لئے اچھی سوغات بھی ثابت ہوگی، عزیز موصوف نے اس پر بطور مقدمہ وتعارف مجھ سے کچھ لکھنے کے لئے کہا، مرحوم علیم صدیقی صاحب سے میرا جو ربط وتعلق تھا اس کی بنا پر میرے لئے اس کی تعمیل مرحوم کا ایک حق ہے جو میں ادا کر رہا ہوں۔

(مولانا) محمد رابع حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۴۲۶/۰۲/۲۲ھ
۲۰۰۵/۰۴/۰۲ء

مرتب کی طرف سے

ذوق عالم اور نجی اسباب کسی بھی زمانے کی گمنام شخصیات کو تاریخ کے سنہرے صفحات پر عیاں کرنے کے لیے سب سے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذوقِ عام سے اس شخصیت اور ہستی کے ہنر اور ہمہ جہت شخصیت کے مختلف اور متنوع پہلو کا اندازہ ہر کس و ناکس کو ہو جاتا ہے۔ نیز نجی اسباب سے اس شخصیت کو اس ہنر اور فن کو منظرِ عام پر لانے میں معین اور مددگار ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسکا یہ مطلب نہیں کہ نابغہ روزگار اور عبقری شخصیات کو ذوق عام اور نجی اسباب میسر اور مقدر ہو ہی جاتے ہیں بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو ذوق عام اور نجی اسباب دونوں سے محروم رہتی ہیں۔ اگر یہ انکے ہنر اور فن کے ساتھ ہوتے تو انکا شمار تاریخی ہستیوں میں ہوتا اور انکے علمی نبوغ اور فنی مہارت کی چرچہ دور دور تک ہوتی۔ لیکن اگر ایسا انکی زندگی میں نہ ہوا تو آنے والی نسلوں کے ذمہ ہے کہ وہ انکے کارناموں کو منظر عام پر لاکر مرحومین کے لیے صدقہ جاریہ اور اپنے لیے انکی خدامت کا ذریعہ بنے۔

ذوق اور اسباب کی ستم ظریفی کوئی جدید شے نہیں ہے۔ چنانچہ اسکی مثالیں متعدد ہیں جو تاریخ کے پرانے صفحات میں دب گئی ہیں یا پھر ابھی بھی یادداشت میں باقی ہیں۔ مثال کے طور پر محمود حسن خان ٹونکی صاحب جو ایک متبحر عالم اور مؤرخ تھے اور انکا شمار ابن خلکانؒ، ابن کثیرؒ اور عبدالحی حسنیؒ جیسے مؤرخین کے ساتھ ہوتا اگر انکی کتاب معجم المصنفین منظر عام پر آتی اور زیادہ سے زیادہ طالبِ علم اسے مستفیض ہوتے۔ لیکن ذوق عام میں بدلتے ہوئے انداز کو دیکھ کر یہ کتاب صرف قصہ ٔ پارینہ بنکر رہ گئی۔

اسی طرح مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ علیہ نے اپنے برادرِ نسبتی کے متعلق لکھا کہ مولانا ابوالخیر

برق حسنی کو علم حدیث پر عبور تھا اور یہانتک موطا امام مالک بھی از بر تھی لیکن بعض نجی اسباب کی ستم ظریفی نے انکے اس علمی نبوغ کا فائدہ عامۃ الناس کو اٹھانے نہیں دیا۔

اسی طرح علیگڑھ یونیورسٹی میں تاریخ کے سابق پروفیسر ہمارے کرم فرما جناب اقبال غنی خان صاحب رحمہ اللہ علیہ کو ہندوستان میں اسلامی تاریخ اور مغلیہ حکومت پر عبور تھا لیکن غیر متوقع طور پر انکی شہادت انکے علمی ذہانت اور تاریخی بصیرت کو ہیکلِ سلیماں کی طرح آنکھوں سے اوجھل کر لے گئی۔

یہ حضرات اور نہ جانے ان جیسے کتنے ایسے گنج گرانمایہ کا تذکرہ اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جس سے جتنا کام لینا ہوتا ہے ویسے ہی اسباب اور ماحول اسکو میسر فرما دیتا ہے۔

عاجز کے والد صاحب مرحوم جناب علیم احمد صدیقی صاحب کا شمار بھی اردو و ادب کے چیدہ اور صفِ اول کے نقادوں میں ہوتا اگر انکو لکھنؤ کے ادبی عروج و ترقی کا عہد ملتا۔ لیکن افسوس انکو لکھنؤ کے ادبی و اخلاقی زوال کا زمانہ ملا جسمیں شعر سخنی تو درکنار شعر فہمی بھی ایک مشکل شے بن چکی تھی۔ یہ رہی بات ذوق عام کی۔ جہاں تک انکے نجی اسباب کا سوال ہے تو انکی صحت میں مسلسل گراوٹ نے انکے ادبی ذوق اور ہنر کو اور بھی پوشیدہ کر دیا۔

ہوش سنبھالنے کے بعد والد صاحب مرحوم کے ساتھ عمر کے تقریباً پندرہ سال مسلسل گزرے۔ اس طویل عرصہ میں (جو مشاہدہ اور صحیح رائے قائم کرنے کے لئے کسی بھی دور اور کسی بھی رشتے کے لئے کافی ہیں) شاید ہی کوئی دن ایسا یاد ہو جس میں والد صاحب مرحوم نے کوئی برجستہ شعر یا کسی ادبی نقطے کی وضاحت سے ہم اہلِ خانہ کو محظوظ نہ کیا ہو۔

انکا عشق اردو زبان تک محدود نہ تھا۔ گو اردو زبان انکی مادری زبان تھی لیکن انکی وسیع

النظری اور ادبی احساس میں عربی ادب بھی شامل تھا۔ ہم تینوں بھائیوں کی گفتگو سے محظوظ و مسرور ہوتے اگر عربی ادب کی برتری یا رعنائی کا انکے سامنے ذکر ہوتا اور خاص صور پر اعجاز قرآنی کے استدلال پر بیحد محظوظ ہوتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ والد صاحب مرحوم کو منجانب اللہ حساس اور دقیق اردو ادب کے متعلق شعور تھا تو یہ مبالغہ آرائی نہ ہوگی۔

چنانچہ آنے والی نسلوں کے ذمہ ہے کہ وہ ان حضرات کے علمی و ادبی کارناموں کی پورے طور پر اہتمام سے نشر و اشاعت کریں تاکہ یہ مرحومین کے لیے صدقہ جاریہ بھی اور ہمارے لیے خدمتِ صالحین بھی ہو۔

اسی غرض کو مدنظر رکھتے ہوئے عاجز نے اس کتاب کو ترتیب دی جسمیں والد صاحب کی ادبی نگارشات کو پیش بھی کیا گیا اور مناسب اشاریے اور حواشی سے قارئین کے ذہن کے قریب تر بھی کیا ہے تاکہ ان مضامین اور خطوط کی ادبی چاشنی کے ساتھ انکی علمی گہرائی کا بھی احساس ہو سکے۔

والد صاحب مرحوم اپنے ارسال کردہ خطوط اور مضامین بہت اہتمام سے ایک جگہ جمع فرماتے تھے۔ چنانچہ اہل خانہ کو انکی تلاش میں قطعاً دشواری نہیں ہوئی۔ مزید اس کے ان مضامین کی خوش کتابت سے مرتب کو اور بھی آسان ہوگئی اور اسمیں شک نہیں کہ اصل نقل سے اچھی ہے۔ اس ضمن میں مجھے ایک واقعہ یاد آیا کہ عیدالاضحیٰ ۱۴۲۴ھ کے موقعہ پر ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں مولانا نعیم الرحمٰن صدیقی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ موصوف مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے خانوادہ کے سلسلۃ الذہب کی ایک اور کڑی ہیں اور مولانا دریابادیؒ کی تفسیری حواشی کو شائع شدہ جلدوں کے ساتھ اضافہ کر کے شائع کر رہے ہیں موصوف نے بتایا کہ مولانا دریابادیؒ کے ہاتھ کی کتابت بہت مشکل سے پڑھی جاتی ہے کیونکہ یہ چھوٹی بھی ہے اور واضح بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تفسیر ماجدی کو

منظرِ عام پر آنے میں اتنے طویل وقفے درکار ہیں۔ عاجز کو خیال آیا کہ والد صاحب مرحوم کے بعض مقالات جو اخبار میں شائع نہ ہو سکے ان مقالات کی اشاعت اور ترتیبِ کتاب کیوقت اس قسم کی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لیکن والد صاحب مرحوم کی شاید مجھ جیسے پست ہمت طالب علم کے لئے یہ بھی ایک احسان تھا کہ انکی مکتوبات اور غیر مصفی مقالات بھی خوش کتابت سے آراستہ ہیں۔ جسمیں ترتیب اور حذف کا بھی کوئی داعیہ نہ پیدا ہوا۔

مرتبِ کتاب مولانا رزین اشرف ندوی صاحب کے خلوصِ نیت اور جناب فیروز پٹھان اور جناب فاروق احمد کی کاوش ومحنت کا تہہ دل سے شکر گذار ہے۔

امید ہے کہ قارئین کرام کو والد صاحب مرحوم کے نثری وشعری نگارشات کا انتخاب پسند آئے گا۔

یوسف عظیم صدیقی
کاوسجی دنشو لائبریری
پونہ
۷/مارچ ۲۰۰۵ء

سلسلۂ نسب اور اسلاف

والد صاحب مرحوم کا سلسلۂ نسب خلیفۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ گو انکے سلسلۂ نسب کا تعین نہ ہو سکا لیکن ثقہ اور متبحر علمائے کرام اور ماہرین انساب سے اس بات کی تصدیق وتوثیق ہوتی ہے۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ معتبر قول جناب عارف قدوائی صاحب لکھنوی کا ہے جو عرصۂ دراز سے انساب کی تحقیق میں ہمہ تن مشغول اور مصروف ہیں۔

آپ کے سلسلۂ نسب میں یقیناً اہل اللہ اور اہل وجاہت گزرے ہونگے لیکن دو علماء کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں بحیثیت مصنف ضرور ملتا ہے۔ پہلے ہیں آپکی نانی صاحبہ (ام سلمہ بی) کے دادا ملا جیونؒ۔ اور دوسرے ہیں آپکی دادی صاحبہ (عائشہ بی) کے دادا حضرت حمد اللہ سندیلویؒ۔ ان حضرات کا تعارف ہندوستان کے مایہ ناز مؤرخ علامہ عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف کردہ نزھۃ الخواطر سے اقتباس کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ جلد ششم میں ان حضرات گرامی کا تذکرہ ہے۔

حضرت ملا احمد جیونؒ:

علامہ عبدالحی حسنیؒ نے آپ کو اِن القاب سے یاد کیا ہے

الشیخ العالم الکبیر العلامۃ بزرگ بڑے عالم علامہ

انکا پورا نام تھا احمد بن ابوسعید بن عبید اللہ بن عبدالرزاق بن خاصۂ خدا آپ کا سلسلۂ نسب شیخ عبداللہ مکی سے ملتا ہے جو نبیٔ خدا حضرت صالح علیہ السلام کی نسل سے تھے۔ آپ کی ولادت ۱۰۴۷ھ میں امیٹھی میں ہوئی اور آپ کا لقب اور عرفیت جیون (یعنی زندگی ہندی زبان میں) تھی۔ آپ نے قرآن شریف کا حفظ سات سال کی عمر میں بلوغ سے پہلے کر لیا اپنے والد صاحب کی نگرانی میں پانچ

سال بعد آپ شفقتِ پدری سے محروم ہو گئے۔آپ نے اکثر درسی کتابیں حضرت محمد صادق سترکھیؒ سے پڑھیں اور بعض کتابیں مولانا لطف اللہ کورویؒ سے پڑھیں۔۱۰۶۹ھ میں آپ نے تعلیم سے فراغت حاصل کی اور درس وتدریس میں مشغول ہو گئے۔۱۱۰۲ھ میں آپ نے سفر حج کیا اور پانچ سال درس وافادہ میں مشغول رہے۔اس کے بعد ہندوستان واپس آئے اور شاہنشاہِ ہندوستان اورنگ زیب عالمگیر رحمہ اللہ علیہ کی دکنی چھاؤنی سے منسلک رہے۔۱۱۱۲ھ میں پھر سے سفرِ حج کا عزم کیا۔اس دفعہ آپ نے ۲/دو حج کیئے ایک اپنے والد کیطرف سے اور ایک اپنی والدہ صاحبہ کی طرف سے۔اسی دوران آپ نے صحیحین (بخاری ومسلم) کا تدبر واہتمام سے مطالعہ کیا جسمیں تشریحات سے بھی مدد لی۔۱۱۱۶ھ آپ امیٹھی واپس آئے۔حضرت لیس بن عبد الرزاق قادری نے خرقۂ خلافت سے نوازا۔دو سال یہاں مقیم رہے اس کے بعد آپ نے دہلی کا رخ کیا۔جب شاہ عالم بن اورنگ زیب جنوبی ہند سے واپس آئے تو انہوں نے آپ کا دہلی میں خیر مقدم کیا اور انھی کی رفاقت میں لاہور کا سفر کیا اور کچھ عرصہ وہیں مقیم رہے۔شاہ عالم کے انتقال کے بعد دہلی آ گئے اور فرخ سیر سے تقرب حاصل ہوا۔

آپ کی تصانیف میں سے مشہور کتاب ''التفسیر الاحمدی'' ہے جو متعدد دینی مدارس میں زیرِ نصاب ہے۔آپ کی وفات ۱۱۳۰ھ دہلی میں ہوئی اور بعد میں تدفین امیٹھی کے مدرسے میں ہوئی۔

علامہ حمداللہ سندیلوی:

مصنف نزهه الخواطر نے ان القاب سے آپ کا تذکرہ کیا ہے؛

الشیخ الفاضل العلامة   فاضل بزرگ علامہ

آپ کا پورا نام تھا حمد اللہ بن شکر اللہ بن دانیال بن پیر محمد صدیقی۔ہندوستان کے مشہور

اساتذہ علم میں انکا شمار ہے۔آپ کی پیدائش اور تربیت سندیلہ میں ہوئی۔سندیلہ لکھنؤ سے قریب واقع ایک قصبہ ہے۔زانوئے تلمذ علامہ کمال الدین فتحپوریؒ اور حضرت نظام الدین بن قطب الدینؒ (بانی فرنگی محل) کے سامنے تہ کئے۔منطق اور فلسفہ میں آپ کو یدطولیٰ حاصل تھا اور آپ اس علم وفن کے امام قرار پائے چنانچہ ابوالمنصور خان نے آپ کی سفارش بادشاہ ہند احمد شاہ سے کی جس نے آپ کو فضل اللہ خان کے خطاب سے نوازا اور کئی گاؤں آپ کے نام کئے۔سندیلہ میں آپ نے ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا۔

آپ کی تصنیف کردہ متعدد کتابیں بہت مقبول ومشہور ہوئیں انمیں سے قابلِ ذکر سلم العلوم از علامہ بہاری کی مختصر مگر جامع شرح ہے۔

١١٦٠ھ بادشاہِ دہلی کے یہاں آپ کا وصال ہوا اور حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے جوار میں آسودہ خاک ہوئے۔

آپ کے دادا اور چچا:

والد صاحب مرحوم کا تعلق اودھ کے ایک معزز وشریف صدیقی گھرانے سے تھا۔والد صاحب مرحوم کے دادا کا نام جناب عزیز احمد صدیقی تھا جو لکھنؤ کے قریب میں واقع ایک چھوٹے سے گاؤں نیوتینی سے تعلق رکھتے تھے۔بسلسلۂ معاش اپنا آبائی وطن ترک کر کے لکھنؤ میں قیام پذیر ہو گئے۔اور قدیم لکھنؤ میں محلّہ قاضی باغ میں ایک مکان خرید لیا۔انساب سندیلہ (از یقین احمد ہاشمی صاحب مرحوم) میں ہے کہ آپ نے حفظِ قرآن بھی کیا تھا۔آپ کا عقدِ نکاح سندیلہ کی عائشہ بی (جو ملا احمد اللہ کی پوتی تھیں) سے ہوا۔جناب عزیز احمد صاحبؒ کے تین لڑکے (محمد احمد، محمد عظیم احمد اور صدیق احمد) اور ایک صاحبزادی (بی بی بصیرن النساء) ہوئے تھے۔

والد صاحب کے بڑے چچا جناب محمد احمد صاحب لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے۔تقسیم ہند

کے بعد آپ پاکستان مستقل طور پر منتقل ہو گئے۔ والد صاحب مرحوم کے چھوٹے چچا جناب صدیق احمد صاحب بہت ذہین اور نابغۂ روزگار شخصیت تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم ندوۃ العلماء میں ہوئی اس کے بعد آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی تعلیم میں حاصل کی۔ کچھ عرصہ آپ پاکستان ریڈیو سے منسلک رہے اس کے بعد بی بی سی لنڈن میں اردو ڈیپارٹمنٹ کے صدر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ آپ کا انتقال لنڈن ہی میں ہوا۔ والد صاحب مرحوم کی پھوپھی (بی بی بصیرن النساء صاحبہ) بہت دیندار اور امورِ خانہ داری کو بہت ذمہ داری سے سنبھالنے والی خاتون تھیں۔ تقسیم ہند کے بعد آپ پاکستان منتقل ہو گئیں۔ جہاں آپ کا انتقال ہوا۔

ڈاکٹر عظیم احمد صدیقی:

ہمارے دادا صاحب کی جائے پیدائش انکا ننیہال سندیلہ تھی۔ سن ولادت ۱۹۰۴ء ہے۔ لکھنؤ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس بخوبی مکمل کرنے کے بعد آپ نے قدیم لکھنؤ کے محلّہ چوک میں مطب کیا۔ ۱۹۳۵ء میں مصطفیٰ احمد صدیقیؒ صاحب کی صاحبزادی رابعہ بانو سے عقد نکاح میں منسلک ہوئے۔ آپ لکھنؤ کے مشہور و معروف اطباء میں سے تھے اور شریف گھرانوں کے طبیب خاص بھی تھے۔ اخیر عمر میں فالج کا اثر ہوا اور اسی میں وفات ہوئی۔ انتقال ۱۹۶۸ء کو لکھنؤ میں ہوا اور عیش باغ میں آسودہ خاک ہوئے۔

والدہ رابعہ بانو:

ہماری دادی صاحبہ (رابعہ بانو) نیوتینی کے شیخ مصطفیٰ احمد صدیقی کی صاحبزادی تھیں۔ آپ کی جائے پیدائش حیدرآباد تھی جہاں آپ کے والد صاحب بہ عہدۂ تحصیلدار فائز تھے۔ نماز اور دیگر عبادات کی آپ بہت پابند تھیں اور ۱۹۷۴ء میں فریضہ حج کی سعادت سے بہرہ مند ہوئیں۔ ۱۹۸۶ء میں لکھنؤ میں مصطفیٰ منزل میں انتقال ہوا اور عیش باغ میں تدفین ہوئی۔ ہماری دادی اور دادا

صاحب کے نو بچے تھے۔ جنمیں پانچ لڑکے (والد صاحب مرحوم، حلیم احمد، سلیم احمد، کلیم احمد، محمد شعیب) اور چار صاحبزادیاں (صوفیہ بانو، واصفہ بانو، پروین بانو، سہیلہ بانو) تھیں۔ والد صاحب مرحوم اور عم محترم کلیم احمد ہندوستان ہی میں رہے اور باقی تین بھائی پاکستان منتقل ہو گئے۔ البتہ تینوں بہنیں (صوفیہ بانو، واصفہ بانو، سہیلہ بانو) ہندوستان ہی میں مقیم ہیں۔ پروین بانو (والد صاحب کی چھوٹی بہن) کا کم سنی میں انتقال ہوا۔

پیدائش:

والد صاحب کی صحیح تاریخ پیدائش کا تعین نہ ہو سکا۔ گو اسمیں کسی حد تک اتفاق پایا گیا کہ آپ کی ولادت ۱۹۳۹ء میں ہوئی۔ آپ کی ولادت لکھنؤ میں واقع آپ کے آبائی مکان مصطفیٰ منزل (محلہ کٹرہ ابو تراب علی خاں) میں ہوئی۔ جناب عتیق میاں صاحب رحمہ اللہ علیہ نے آپ کے کان میں اذان دی۔

ابتدائی تعلیم:

جب آپ پانچ برس کے ہو گئے تو مختلف اساتذہ اور قراء سے آپ کی دینی تعلیم کا آغاز کیا گیا۔ اسمیں مولوی ثاقب لکھنوی، مولانا عبدالکلیم خان اور حکیم محمد سلیمان رحمہ اللہ علیہم قابل الذکر ہیں۔ آپ کے ان ابتدائی دروس میں آپ کی ہمشیرہ صوفیہ بانو اور چھوٹے بھائی حلیم احمد شامل ہوتے تھے۔ قرأتِ قرآن کی تعلیم حاصل ہونے کے بعد آپ کو باقاعدہ انگریزی اسکول میں داخل کرایا گیا۔

کالج کی تعلیم:

والد صاحب مرحوم کی تعلیم جوبلی کالج (لکھنؤ) میں ہوئی اس کے بعد آپ نے شیعہ کالج (لکھنؤ یونیورسٹی) میں پڑھا۔ ۱۹۶۲ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی ایس سی (زولوجی) بخوبی مکمل کیا۔

لکھنؤ کے مشاعرے:

اسمیں شک نہیں کہ نوابین کے اقتدار ختم ہونے کے بعد اردو ادب اور شاعری میں مسلسل طور پر

انحطاط آتا چلا گیا لیکن یہ انحطاط آج کی موجودہ صورتِ حال کے لئے بھی بامِ عروج ہے۔

۱۹۵۰ء میں جب والد صاحب مرحوم کے عنفوان شباب کا زمانہ تھا اس وقت معیاری مشاعرے اور ادبی محافل کا انعقاد ہونا لکھنؤ کی روزمرہ زندگی کا ایک اہم حصہ تھے۔ جن شعراء کا کلام آج تاریخی اور مثالی ادب کا حصہ ہے ان شعراء کے کلام کو سنا یقیناً ایک ادبی فضیلت کا مقام رکھتا ہے۔ چنانچہ والد صاحب مرحوم نے جگر مراد آبادیؒ، ساحر لدھیانوی، مجاز رودولوی، فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی جیسے شعراء کا کلام براہِ راست لکھنؤ کے مشاعروں میں بارہا سنا۔ مزید اس کے شوکت تھانوی صاحب مرحوم (جنکی ناقدانہ اور مزاحیہ ناولوں اور کتابوں نے آج بھی قارئین کو ہسایا ہے) کو والد صاحب مرحوم نے دادا صاحب مرحوم کے یہاں بطور رفیق خاص بارہا دیکھا تھا۔

اہل اللہ سے تعلق:

میلاد النبی ﷺ کا انعقاد ہمارے آبائی مکان مصطفیٰ منزل میں ہمارے دادا صاحب (ڈاکٹر عظیم صدیقی مرحوم) کی زیرِ نگرانی بہت اہتمام سے ہوتا تھا۔ اسمیں علمائے حق بھی شرکت کرتے کیونکہ ان محافلِ دینیہ میں خلافِ شرع وسنت کوئی بات نہ ہوتی۔ کوئی مستند عالمِ دین کی تقریر کا اہتمام ہوتا اور اس کے بعد عشائیہ ہوتا۔ بجز اسکے کچھ نہ ہوتا۔ چنانچہ والد صاحب کو اس سلسلے میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمتہ اللہ علیہ کی تقریر بخوب یاد تھی۔ مزید اسکے مفسر قرآن علامہ عبدالماجد دریابادیؒ آپ کے رشتے میں خالو ہوتے تھے۔ اور کم سنی سے خاتون منزل جو مولانا دریابادیؒ کی دولت کدہ تھی اسمیں آپ کا بدستور آنا جانا تھا۔ آپ بسلسلۂ ملازمت بمبئی میں مقیم تھے کہ دادی صاحبہ نے آپ کو تاکیداً کہا کہ آپ شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری (خلیفہ حکیم الامت حضرت اشرف علی تھانویؒ) سے شرفِ ملاقات حاصل کریں۔ چنانچہ والدہ کے حکم کے ایماء میں آپ نے حاضری دی اور خصوصی دعاؤں کے ساتھ واپس ہوئے۔ جدہ کے دورانِ قیام میں آپ کو متعدد اہل اللہ سے ملنے کی سعادت

ملی۔ چنانچہ اس مبارک سلسلہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ، قاری ابرار الحق ہردوئیؒ، حکیم اختر صاحب کراچوی، مولانا عبدالشکور ترمذی، صوفی عبدالرحمٰنؒ، عبداللہ عباس ندوی اور مولانا رابع حسنی ندوی جیسے بلند پایہ اہل علم وعرفان سے ملنے کا شرف حاصل رہا۔ بیعتِ اصلاح آپ نے حضرت قاری امیر حسن صاحب (خلیفہ حضرت شیخ الحدیث کاندھلویؒ) سے کی۔

ملازمت:

کالج کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد والد صاحب مرحوم نے فائی لیریا ڈیپارٹمنٹ میں بحیثیت جونیئر افسر کے کام کیا۔ اس سلسلے میں لکھنؤ کے مضافات میں واقع بارہ بنکی میں عرصہ تک والد صاحب بذریعہ معاش مقیم رہے۔ ۱۹۷۱ء میں بومبے ڈائنگ میں ملازمت اختیار کی۔ اس کے بعد کچھ عرصہ دہلی میں رہے اسکے بعد بمبئی کا سفر ہوا جس سے کے بعد سعودی عرب کا سفر ہوا۔

سفرِ سعودی عرب:

۱۹۷۴ء میں والد صاحب مرحوم کے چھوٹے بھائی حلیم احمد صدیقی صاحب نے سفر حج کا عزم کیا۔ ادھر ہندوستان میں دادی صاحبہ کو بھی فریضۂ حج ادا کرنے کی خواہش ہوئی اور منجانب اللہ اسباب مہیا ہوتے چلے گے۔ نتیجۃً والد صاحب مرحوم دادی صاحبہ کی معیت میں بحیثیت محرم اور معاونِ سفر بنکر فریضہ حج پر روانہ ہوئے۔ فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد ملازمت کے لیے جدہ میں قیام اختیار کیا۔ بعد میں ذاتی کاروبار شروع کردیا اور اس سفر میں متعدد بیرونی ممالک کے اسفار بھی ہوئے۔

سفرِ آخرت:

والد صاحب کو پہلا قلبی دورہ ۱۹۸۹ء میں پڑا۔ اسکے بعد مسلسل صحت میں گراوٹ کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۵ء میں دوسرا قلبی دورہ پڑا۔ صحت کی وجہ سے والد صاحب ادبی مصروفیات سے دور

رہتے اور خاص طور سے تقریر کرنے سے گریز کرتے ۔لیکن اس کے باوجود جوذخیرہ ہم تک پہونچا وہ بلند ادبی معیار کی ضرور عکاسی کرتا ہے۔

۱۹رفروری ۲۰۰۲ء کووالد صاحب کی طبیعت بہت خراب ہوگئی اور آخر کار انکے خالہ زاد بھائی جناب سید محمد خالد صاحب کی گاڑی میں کینگ فہد ہسپتال لے جایا گیا۔لیکن الاجل الموعود آ گیا تھا اور نمازِ مغرب کے قریب ۸ ذی الحجہ کے شروع ہونے سے تھوڑی دیر پہلے انتقال فرما گئے۔

انتقال کے وقت ہماری والدہ صاحبہ اور ہمارے بھائی صاحب انکے پاس تھے۔ راقم السطور اور بڑے بھائی جناب محمد عبداللہ پونہ میں تھے۔ میں اپنی پڑھائی کے سلسلہ میں پونہ میں مسلسل طور پر مقیم تھا اور بھائی صاحب ویزے کے سلسلے میں کچھ روز کے لیے پونہ آئے ہوئے تھے۔ یہ خبر سنکر معلوم ہوا کہ جیسے بجلی گر پڑی ہو۔لیکن جس جمِ غفیر نے نمازِ جنازہ ادا کی جن میں اکثر و بیشتر حجاج کرام اور ضیوف الرحمٰن تھے اور بعد میں مکہ مکرمہ کی مٹی نصیب ہونا اور علمائے عرب (جن سے والد صاحب کو بے حد محبت اور تعلق تھا) جیسے شیخ علی الطنطاوی اور شیخ عبدالعزیز بن باز کا جوار نصیب ہونا اس نہ ختم ہونے والے غم کو یقیناً کم کر گئے ۔فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

پسماندگان:

والد صاحب کا عقد ازدواج والدہ صاحبہ سے ۵رنومبر ۱۹۶۹ء کو لکھنؤ کے مشہور علمی خانوادہ کی رہائش گاہ فرنگی محل میں ہوا تھا۔ کیونکہ والد صاحب موجودہ خاندان کے افراد کے سب سے بڑے بھائی تھے اسلیے سارے بھائی بہنوں نے بڑے اہتمام سے شرکت کی۔

والدہ صاحبہ کا نام ناہید بنت انوار اللہ صدیقی ہے۔آپ کی جائے پیدائش اورنگ آباد کی ہے۔آپ کے آباء واجداد اورنگ آباد (جو مملکتِ اصفیہ کا اس دور میں ایک اہم شہر تھا) منتقل ہو گئے تھے۔ والدہ صاحبہ کے والد (یعنی ہمارے نانا) جناب انوار اللہ صدیقی صاحب کا تعلق بنکی کے

صدیقی گھرانے سے تھا۔آپ کے دادا جناب نعیم اللہ صدیقی صاحب اور آپ کے والد جناب خلیل احمد صاحب کی متصلہ قبریں خلد آباد میں واقع ہیں۔ نانا صاحب نے کالج کی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کی اور ایم اے انگریزی بخوبی پورا کیا۔ بسلسلۂ ملازمت مستقلاً جنوبی ہند میں مقیم رہے اور پونہ میں ۱۹۷۴ء میں وفات ہوئی۔ والدہ صاحبہ کی والدہ (ہماری نانی صاحبہ) کا تعلق بارہ بنکی سے قریب واقع قصبہ بانسہ سے تھا۔ انکا نسبی تعلق حضرت نظام الدین فرنگی محلی رحمہ اللہ علیہ کے روحانی استاذ اور پیر طریقت شاہ عبدالرزاق بانسویؒ سے تھا۔ انکی وفات ۱۹۷۱ء لکھنو میں ہوئی اور تدفین حضرت بانسویؒ کے قرب میں ہوئی۔

والد صاحب اور والدہ صاحبہ کے چھے بچے ہوئے تھے۔ جنمیں تین کم عمری میں انتقال کر گئے۔ انکے نام تھے حسن عظیم اور حسین عظیم (انتقال ۱۹۷۱ء) اور ہارون عظیم (انتقال ۱۹۷۴ء) انکی پیدائش اور انتقال لکھنؤ میں ہوئی اور تدفین لکھنؤ کے عام قبرستان عیش باغ میں ہوئی۔

اسکے علاوہ والد صاحب اور والدہ صاحبہ کے تین بچے بقید حیات ہیں۔ وقار عظیم، محمد عبداللہ اور راقم السطور۔

ہمارے بڑے بھائی (یعنی وقار عظیم) کی پیدائش لکھنؤ میں انکے آبائی مکان مصطفیٰ منزل میں ہوئی بروز ۳۰ راگست ۱۹۷۲ء۔ ۱۹۷۶ء میں والد صاحب کی معیت میں سعودی عرب منتقل ہو گئے اور اس کے بعد انکی تعلیم جدہ کے عربی اسکول روضۃ المعارف میں ہوئی۔ اس کے بعد عثمان بن عفان نامی اسکول سے بارہویں تک تعلیم مکمل کی اور ۱۹۹۱ء میں ہندوستان منتقل ہو گئے بغرض تعلیم یہاں انکا داخلہ غوثیہ کالج (رام نگرم، بنگلور) میں ہوا۔ ۱۹۹۶ء میں تعلیم مکمل کر کئے اور بی ئی انجینیر نگ سیول کی ڈگری کے ساتھ جدہ واپس آئے اور سیٹہ نامی کمپنی میں ملازم ہیں۔ ۲۰۰۱ء میں انکا عقدِ نکاح بارہ بنکی کے جناب وسیم الحسن چودھری کی صاجزادی (اُمیمہ وسیم الحسن) سے ہوا۔ ۲۰۰۳ء میں آپ کا زید احمد نامی بیٹا ہوا۔ اللھم بارک فی حیاتہ.

دوسرے بیٹے محمد عبداللہ کی پیدائش بھی لکھنؤ کے مصطفیٰ منزل میں ۱۹۷۷ء میں ہوئی۔ تعلیمی سرگرمیاں روضۃ المعارف اسکول سے شروع ہوئیں اور بارہویں تک وہیں زیر تعلیم رہے۔ دہلی میں مقابلے میں بیٹھے اور آئی آئی ٹی میں داخلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ۲۰۰۲ء کو جدہ منتقل ہو گئے اور برطانوی کمپنی بی پی میں برسرِ روزگار ہیں۔ جنوری ۲۰۰۴ء کو آپ کا عقدِ نکاح عمِ محترم جناب محمد ادیب صاحب کی صاحبزادی (افشاں ادیب) سے ہوا۔

راقم السطور کی پیدائش ۱۵/نومبر ۱۹۸۱ء کو جدہ میں ہوئی۔ دونوں بھائیوں کی طرح روضۃ المعارف سے ابتدائی تعلیم سے لیکر بارہویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ۲۰۰۰ء میں پونہ کے مشہور کالج نیس واڈیا میں کامرس (بی کام) میں داخلہ ملا۔ ۲۰۰۵ء میں ٹاسمک (پونہ) سے ایم بی اے مکمل کیا۔ والد صاحب کی خصوصی ہدایات اور والدہ صاحبہ کی ہمت افزائی کی وجہ سے عربی مطالعہ جاری رکھا اور بفضلہ تعالیٰ مولانا محمد رابع ندوی صاحب کی کتاب سمرقند اور بخاری کی بازیافت کا ترجمہ عربی میں کیا۔ وللہ الحمد اولہ و آخرہ۔

قلمِ علیم

والد صاحب مرحوم ایک اچھے انشا برداز ادیب تھے۔ انکے تحریری شوق میں انکے ادبی مطالعہ اور لکھنؤی تہذیب کا بہت رنگ دکھتا ہے۔

انکے اساتذہ میں غلام احمد فرقت کاکوروی جیسے ناقد اور صاحب طنز ومزاح تھے جو انکے خالہ زاد بہنوئی ہونے کے ساتھ ساتھ انکے دہلی کے قیام کے دوران انکے پڑوسی بھی تھے۔ غلام احمد فرقت کاکوروی صاحب کی مشہور کتاب ناروا اور مداوا ادبی اور علمی حلقوں میں ہلچل مچا چکی تھی۔ والد صاحب مرحوم نے جب دہلی کو خیر باد کہا اور بلادِ عرب منتقل ہوئے تو انکے انداز میں ادبی تنقید کے بھرپور جذبہ اور شوق تھا۔ گو اس جذبہ اور شوق سے زبان میں نکھار اور چاشینی کا اضافہ ہوتا ہے لیکن بیجا بحث ومباحثے کا ایک لامتناہی سلسلہ ضرور کھل جاتا ہے۔ چنانچہ جدہ کے قیام کے دوران والد صاحب مرحوم کے رشتہ کے بھائی عم محترم محمد یامین عثمانی صاحب (مقیم حال کراچی) نے اس ادبی ذوق کو دینی رنگ اور شرعی معیار پر اتارا۔ لہٰذا والد صاحب مرحوم نے ان دونوں مربیانِ کریم کی ہدایات کو مدنظر رکھا اور ادبی مضامین میں اعتدال قایم رکھا اور دینی مضامین میں ادبی اسلوب اپنایا۔

رمضان المبارک کی برکت وعظمت

(شائع شدہ اُردو نیوز۔جدہ)

رمضان المبارک کا مقدس مہینہ بارانِ رحمت کا تواتر سے نزول۔خطا اور لغزش کی معافی غرض یہ کہ فیضانِ ربی کا ایک لا متناہی سلسلہ ہوتا ہے جو اس ماہ مبارک میں بہر خاص و عام مسلمین و مسلمات کے لئے جاری وساری ہو جاتا ہے۔ساکنین بلادِ عرب اس ماہ مبارک میں عمرہ اور طواف کی سعادت سے بھرور ہوتے ہیں۔دور دراز ممالک سے آنے والوں کی تعداد بھی شمار کے بڑے اعداد تک پہنچ جاتی ہے۔مقیمین جدہ اس معاملے میں دوسرے حضرات سے خوش نصیبی میں سبقت رکھتے ہیں کہ حرم شریف کی مسافت جدہ سے بمشکل ایک گھنٹہ کی ہے بعض حضرات بلا ناغہ حرم میں افطار کرتے ہیں اور تراویح کی ادائیگی کے بعد واپس جدہ آتے ہیں۔حرم کعبہ کی حاضری سبحان اللہ ایک نظر ڈالئے تو ثواب کی جھڑی لگ جاتی ہے طواف کیجئے تو رحمت کی موسلا دھار۔نماز پڑھئے اور جبرئیلِ امیں کی ہم آہنگی کا لطف اٹھاتے رہیے۔

ہمسایہ　جبرئیلِ　امیں　بندۂ　خاکی

ایک طرف فیضانِ رحمت کا ایسا نزول اور دوسری جانب شیطان الرجیم کی گرفت ضعیف مسلمین ومسلمات پر اور بھی سخت ہو جاتی ہے۔حدیث مبارکہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق اس ماہِ مبارک میں شیطان قید کر دیا جاتا ہے لیکن جب ہم اپنے اردگرد بعض افراد کے متضاد اعمال کو دیکھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ قول صادق صلی اللہ علیہ وسلم تو اسکی نظر بندی کا ہے لیکن اسکی حرکتیں اور شرارتیں اس مبارک ماہ میں بھی جاری رہتی ہیں۔شاید وہ جہاں بھی قید کیا جاتا ہو گا وہاں سے اپنے

میں ممنوع ہیں اسکی کھلی اجازت دیدیتا ہے۔ جبکہ اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں صاف فرمادیا ہے جس کا مفہوم ہے کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب یہ آپ کے پاس کوئی معاملہ لائیں اور آپ انکے مابین جو بھی فیصلہ کردیں تو اسکو یہ خوشی خوشی پورے کا پورا قبول وتسلیم کرلیں اور اگر ایسا نہ کریں تو ایمان نہیں ہے۔ اب اس آیتِ مبارکہ کی روشنی میں ملاحظہ فرمایئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام فیصلے کردیے یعنی ماں باپ کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے، بھائی بہنوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا ہے۔ عزیز واقارب کے ساتھ کیسے معاملہ کرنا دوست واحباب ہوں یا دشمن سب کے ساتھ کیسے پیش آنا ہے۔ عزیز واقارب کے ساتھ کیسے معاملہ کرنا دوست واحباب ہوں یا دشمن سب کے ساتھ کیسے پیش آنا ہے۔ غرض یہ کہ ہر بات کو نہایت صریح اور واضح انداز میں ہم سب کی ہدایت کے لیے بتادیا گیا ہے۔ لیکن جب معاملہ اپنے پر پڑتا ہے تو اس نامۂ ہدایت کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ صرف اور صرف اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے۔ آپ کے عمرے، طواف، تلاوت اور اس ماہِ مبارک کے روزے، کس نفع اور فائدے کے اگر ان سب سے آپ کے اپنے نفس کی اصلاح نہ ہوسکی۔ اگر معاملات میں کیفیت یہ ہے کہ جسکو پسند کرتے ہیں اسکے سلام کا جواب دیتے ہیں ورنہ منہ پھیر لیتے ہیں جبکہ فرمانِ محترم صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ سلام کو عام کرو اور آپ ہیں کہ خود سلام کرنا تو درکنار دوسروں کے سلام کا جواب بھی نہیں دیتے۔ تو آپ کی وہ تمام عبادات وریاضت حقیقتاً ایک شیطانی ڈھکوسلہ اور فریب ہے جس میں آپ ایسے گرفتار ہیں کہ آپ کو اپنی خطا بھی عمل صالح نظر آتی ہے۔

مثلاً یہ رشتے ناتے درحقیقت اللہ رب العزت کا ایسا احسان ہے جس پر جتنا بھی شکر ادا کیجئے کم ہے۔ ماں اور باپ کے توسط سے عطا ہونے والے رشتے در وجواہر اور مال ودولت سے نہیں خریدے جا سکتے۔ جب آپ خود ان رشتوں کو آپ توڑ بھی نہیں سکتے لیکن مقام عبرت ہے جب بہت سے افراد عبادت کی بہتات میں مگن ہوجاتے ہیں اور رشتے جیسے انعام ربی کو منقطع کرکے سکون محسوس کرتے

ہیں۔ یہ ماہِ مبارک خطا کی معافی، اعمال کی اصلاح اور بخشش کے حصول کا مہینہ ہے اس سے پہلے کہ آخری دستک ہو جائے اور دستک دینے والا نہ مہلت دے اور نہ موقع بس اپنے ساتھ لے جائے تو ہم آپ اپنے اعمال کی اصلاح کی بھر پور کوشش کرلیں اور اس یقین کے ساتھ کہ

سرسبز اس یقین پر ہے اپنی کشتِ ویراں
ائینگے اس طرف بھی ایک روز ابر باراں

اور ان شاء اللہ اس ماہِ مبارک کے طفیل سابقہ خطا کی معافی اور بُرے اعمال کی اصلاح ہو جائے گی۔
دعاؤں کی تکرار رکھیئے ان شاء اللہ خیر و برکت کا نزول ایسا ہوگا کہ تمام لغزشیں خس و خاشاک کی مانند بارانِ رحمت میں بہہ جائینگی۔

عالمِ انسانی پر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے احسان مبارک

(خاکِ طیبہ ٹرسٹ کے سیمنار سیرت ۱۹۹۶ء میں زیرِ صدارت جناب مصلح الدین سعدی پڑھا گیا مقالہ)

اس سے پہلے کہ موضوعِ سخن کی تشریح وتوجیہ کروں میں آپ حضرات کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اس خوش بختی اور فوز العظیم کی جس کی نشاندہی اور بشارت سرکار دو عالم ﷺ کے اس فرمانِ مبارک سے عطا ہوتی ہے۔ صحیح بخاری میں مرقوم اس حدیثِ مبارک کا مفہوم یوں ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا ''یارسول اللہ ﷺ! ہم قیامت میں کہاں ہونگے؟'' رحمتِ عالم ﷺ نے پوچھنے والے سے سوال کیا ''میری نسبت کیا گمان رکھتے ہو؟ بلا تاخیر وتردد انہوں نے جواب دیا آپ سے محبت کرتے ہیں۔'' اس اظہارِ حق پر نبی صادق ﷺ کی بشارتِ عظمٰی ہم سب کی طمانیتِ قلب کا باعث اور ہماری ہر راہِ عمل کے لئے مشعلِ ہدایت رسول امین نے فرمایا کہ ''جیسے اشخاص سے محبت کرتے ہو، حشر میں حشر بھی انہیں کے ساتھ ہوگا۔'' سبحان اللہ رسول اللہ ان کے اصحاب اور امت کے صالحین سے محبت ہے تو انشاءاللہ حشر میں بھی آفتاب رسالت اور کواکبِ رشد وہدایت کی ضیاء پاشی سے ہم جیسے گناہ گار اور خطا کار کو بھی نور علیٰ نورؒ کے انوارِ رحمت سے نوازا جائیگا۔

یہاں ہم سب کے جمع ہونے کا مقصد رسول اللہ ﷺ سے محبت چاہت اور نسبت ہی تو ہے۔ رحمتِ عالم کے خالق اے رحمت تمام تو ہی ہمارے اس جذبہء اخلاص اور نیتِ عمل کو قبول کرنے والا ہے۔ اے مقلب القلوب ہم کو اپنی سب سے پیاری تخلیق کی ایسی محبت اور ایسی وابستگی

عطا کر دے کہ اس ارض و سماء کا ذرہ ذرہ زبانِ حال سے یوں تصدیق کرے۔

جہانِ آب وگل سے عالم جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغان تو ہے

حدیثِ نبوی ہے کہ آپ نے فرمایا ''اللہ نے سب سے پہلے میرے نور کو پیدا کیا'' یہ ارض وسماء، یہ کون ومکاں، یہ عالم آب وگل ان جملہ تخلیقات سے پہلے اللہ جل شانہ نے اپنی مشیت کے انوار سے اس نورِ مبارک کو پیدا کیا جس کے ظہور اور فیضِ عام کے لئے ہر تخلیق وجود میں لائی گئی۔ شیخ المشائخؒ نے کیا حسن انداز میں حقیقت پیش کی

سب سے پہلے مشیت کے انوار سے نقشِ روئے محمدی بنایا گیا
پھر اسی نقش سے مانگ کر روشنی بزمِ کون ومکاں کو سجایا گیا

اس نورِ مبارک کی تخلیق سب سے پہلے پھر مخلوقاتِ عالم کی تخلیق حدیثِ مبارک ہے کہ مخلوقاتِ عالم کی تخلیق کے بعد اللہ جل شانہ نے لوحِ محفوظ پر لکھ دیا کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے چنانچہ ربِ کریم نے اپنی غالب صفت یعنی رحمت کا مظہر اپنی تخلیقِ اول کو قرار دیا۔ اور رحمۃ للعالمین کے مرتبہء عالیہ پر فائز کر دیا۔ باری تعالیٰ نے اپنے الفاظ میں یوں تصدیق فرمائی۔

وما ارسلناک الا رحمة للعالمین

الرحمٰن الرحیم نے یوں نہیں فرمایا کہ یہ رحمت صرف مسلمین کے لئے ہی ہے، یا یہ رحمت صرف مومنین کے لئے ہے یہاں تو صاحبِ الطاف عمیم کی طرف سے یوں تصدیق ہو رہی ہے کہ یہ بحرِ رحمت یہ دریائے جود وسخا اور یہ ابرِ کرم مخلوقاتِ عالم کے لئے رواں دواں ہے گو کہ اطاعت گزاروں کے لئے رحمت خاص ہے لیکن منکرین اور نافرمان کو مطلق محروم نہیں کر دیا گیا۔ ربیع الاول کا مبارک مہینہ ۲۰ اپریل ۵۷۱ء عیسوی کی صبح مبارک کو عالمِ بالا سے سیدہ بی بی آمنہ بنتِ وہب

کی آغوش مبارکہ میں آفتابِ رسالت کا ظہور ہوا۔مخلوقاتِ عالم روزِ ازل سے جس چشمہ ءرشد وہدایت کی منتظر تھیں اسکے فیضِ عالم کے جاری وساری ہونے کا اعلان بفضل ربی ہوگیا دعائیں قبول ہوئیں اور نوید وبشارت کا ظہورِ پُر انوار ہوا۔

ہوئی پہلوئے آمنہ سے پیدا دعائے خلیل اور نوید مسیحا

جدِ محترم عبد المطلب بن ہاشم نے اپنے اس درِ یتیم کا نام نامی محمد ﷺ رکھا۔محمد اہلِ قریش کی لئے زبانِ عربی کی غیر مانوس ترکیب کی وجہ تسمیہ پوچھی تو عبد المطلب نے فرمایا کہ ''میرا بیٹا وہ ہے جس کہ حمد یعنی تعریف ارض وسماء میں ہوگی''۔میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ مشیتِ ربی نے یہ الفاظ بطورِ خاص عبد المطلب سے ادا کروائے ہونگے تا کہ قوم کو معلوم ہو جائے کہ

وہ تم سے ہے
تم میں ہے
لیکن تم سا نہیں ہے
گو کہ بنی آدم ہے لیکن منتخبِ عالم ہے

ع۔۔　جبرئیل امیں سے یہ خبر سبکو ملی ہے
خاکی ہے مگر نور کے پیکر میں ڈھلی ہے

چالیس برس گزر گئے اور قوم نے صادق وامین جیسے القاب سے پکارا لیکن جب عمر دنیوی کے چالیسویں سال غارِ حراء میں پہلی وحی نازل ہوئی اور حراء سے اتر کر آنے والے صادق وامین نے جب اپنی قوم کو وہ نسخہ ءکیمیاء پیش کیا جو اقوامِ عالم کے ہر مرض کا تریاق اور ہر درد وکسک کے لئے اکسیر تو جو قوم کے نظروں میں صادق وامین تھا،وہی اب شاعر ؑمجنونؑ نظر آئے گا اعلانِ حق پر ایسی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا کہ الحفیظ والامان اپنے پرائے ہوئے اور آشنا بیگانہ،جس نے حمایت پر

کمر باندھی اسی پر قوم نے کمر توڑ ظلم وستم ڈھائے۔ پرستاران معبودان باطل کے جور وستم جب حد سے بڑھنے لگے تو رحمتِ عالم نے اپنے بعض اصحاب کو ہجرت کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ایک مختصر جماعت افریقہ کے مشہور ملک حبشہ ہجرت کر کے وہاں کی عیسائی حکومت میں پناہ گزیں ہوئی۔ مشرکین قریش اس کو برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے اپنا ایک وفد اس عیسائی بادشاہ کے دربار میں بھیجا تاکہ سرکاری طور پر فدایانِ نبی ﷺ کو بے دخل کرواسکیں اور پھر ان کو اپنے جور وستم کا نشانہ بنائیں۔ عیسائی بادشاہ نے مشرکین کی درخواست پر مہاجرین اسلام کو اپنے دربار میں طلب کیا تاکہ صحیح صورتِ حال سے واقفیت ہو سکے۔ رسول اللہ ﷺ کے عم زاد سیدنا جعفر ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے عیسائی بادشاہ کے دربار میں ایسی جامع تقریر فرمائی جو مختصر فرمانے کے باوجود نہایت واضح تھی جس سے اس دور کی ظلمت وگمراہی کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے اور رحمتِ عالم کے توسط سے اقوامِ عالم پر جن احسان ہائے عظیم کا نزول ہونا شروع ہو گیا تھا، اس کی بھی نشاندہی ہوتی ہے۔

سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بادشاہ اور درباریوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

''اے بادشاہ! ہم پر ایک طویل وتاریک زمانہ گزرا ہے اس وقت ہماری جہالت کا یہ عالم تھا کہ ایک خدا کو چھوڑ کر بتوں کی پرستش کرتے تھے اور خود ساختہ پتھروں کی پوجا ہمارا شعار تھا۔ قطع رحمی صبح وشام کا ہمارا مشغلہ، ہمسایوں کے حقوق سے بیگانہ رحم وانصاف سے ہم نا آشنا اور حق وباطل کے امتیاز سے ہم ناواقف غرض ہماری زندگی سرتا پیر درندوں کی طرح تھی کہ قوی ضعیف کو کچلنے اور توانا ناتواں کو ہضم کر لینے کو اپنے لئے فخر اور طرۂ امتیاز سمجھتا تھا۔ رحمت خدا کا کرشمہ دیکھئے کہ اس نے ہمارے اندر ایک بزرگ پیغمبر مبعوث کیا۔ جس کے نسب سے ہم واقف جس کی صداقت امانت اور عصمت پر دوست ودشمن دونوں گواہ جس کی قوم نے اس کو محمد الامین کا لقب دیا۔ وہ آیا اور اس نے ہم کو خدا کی توحید کا سبق دیا۔ خدائے واحد کی جانب بلایا اس نے بتلایا کہ خدا کا کوئی وسیم اور شریک نہیں۔

وہ شرک سے پاک ہے، بت پرستی جہالت کا شیوہ ہے اس لئے قابلِ ترک ہے اور صرف خدائے واحد کی ہی عبادت حق عبدیت ہے اس نے ہم کو حق گوئی اور صداقت شعاری کی تلقین کی اور صلہ رحمی کا حکم فرمایا اور فحش کہہ کر اس ننگ انسانیت سے ہم نجات دلائی نکاح میں محارم اور غیر محارم میں فرق بتایا، جھوٹ بولنے، ناحق مالِ یتیم کھانے کو حرام فرمایا، نماز اور خیرات کی تعلیم دی، اور ہر حیثیت سے ہم کو حیوانیت کے قعرِ مذلت سے نکال کر انسانیتِ کبری کے مرتبہ پر پہنچایا۔ بادشاہ ہم نے اس مقدس تعلیم کو قبول کیا اور اس پر صدقِ دل سے ایمان لائے یہ ہمارا وہ قصور ہے جس کی بدولت یہ مشرکین کا وفد تجھ سے مطالبہ کرتا ہے تاکہ تو ہم کو ان کے حوالے کر دے۔''

سیدنا جعفر کی اس تقریر کے بعد بادشاہ نے وفد کی درخواست نامنظور کر دی اور اس طرح مشرکین کو پہلی شکست اٹھانا پڑی۔ اس تقریر کی روشنی میں اس دورِ مذلت و جہالت کے چند بدنما اور تاریک داغوں پر بھی سرسری نظر ڈالئے رحمتِ عالم کی بعثت ﷺ سے قبل دنیائے ارضی پر چار مذاہب کا عمل دخل تھا۔ ہندو، مجوسی، یہودی، اور عیسائی۔ اپنی مذاہب کے عقائد اور فکر و نظر اس دور کے بدھ مت کی سادگی اور انفرادیت کو بھی اپنے اندر ضم کر لیا اور بدھ مت بھی ہندو مت کی ایک جدید شکل ہوگئی۔ عوام اور خواص میں دو جداگانہ مذہبی انداز فکر مروج تھے۔ خواص کے لئے وحدت الوجود اور عوام کے لئے اصنام پرستی لیکن خواص بھی وحدت الوجود کے مسئلے میں ایسے الجھے کہ بالآخر اصنام پرستی ہی عبادت کا رکنِ اعظم قرار پائی اور چھٹی صدی عیسوی میں دیوی دیوتاؤں کی تعداد تیس کروڑ سے بھی تجاوز کر گئی تھی۔ مذہبی ٹھیکے داروں نے عوام میں مذہب کی مقبولیت بڑھانے کے لئے جنسی اور شہوانی جذبات کے فروغ اور ان کی تسکین کا سہارا لیا۔ چنانچہ لنگم کی پوجا بھی ایک مقدس اور ایسا مقدس فریضہ قرار پائی جس میں مرد وعورت، بھائی بہن، ماں بیٹا سب ہی ایک وقت میں شریک ہوتے۔ نہ احساسِ ندامت نہ عصبیت کا شعور یہی وجہ ہے کہ عبادات کے بیشتر مراکز جنسی بے راہ

روی اور اخلاقی پستی کا ٹھور ٹھکانہ تھی۔ وقت کم ہے اس لئے مجوسی، یہودی، اور عیسائی مذاہب کی بے راہ روی پر کچھ نہ کہہ سکوں گا۔

رحمتِ عالم کا ہر احسان حقیقتاً احسانِ عظیم ہی جس پر جتنا غور وفکر کیجئے اس کی اہمیت وافادیت جلوہ بہ جلوہ نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ ان تمام احسانات میں جس کا صحیح علم صرف اللہ رب العزت کو ہے یہ احسان بھی کتنا عظیم ہے کہ رحمتِ عالم نے معاف کرنے کے انداز بھی سکھائے وگرنہ اس سے قبل نہ معافی تھی اور نہ تلافی۔

صدیاں کشت وخون کی نذر ہوتی جاتی تھیں پھر بھی دل کی کدورت باقی رہتی تھی، چشمِ تصور سے فتحِ مکہ کا وہ منظر ملاحظہ کیجئے۔ رحمتِ عالم کے روبرو ہیں وہ مغلوبین جنہوں نے سرکارِ دو عالم ﷺ اور ان کے اصحاب کو بے حد اذیت وتکالیف دی تھیں۔ لیکن آپ نے ان سب کو معاف کر دیا اور سب کو آزاد کر دیا۔

سیدنا یوسف علیہ السلام نے بھی معاف کر دیا تھا اور فرمایا تھا لا تثریب علیکم الیوم لیکن وہ عفو ودرگزر اپنے بھائیوں کے لئے اور یہاں رحمتِ عالم ﷺ نے ان کو بھی معاف کر دیا جن سے نہ قرابت نہ خون کا رشتہ یہ فیض تھا رحمۃ للعالمین کا۔

فتحِ مکہ کے بعد جب ایک شخص لرزتا کانپتا آپ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا تو آپ نے شیریں گفتار کے ساتھ ارشاد فرمایا "گھبراؤ نہیں میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تو خشک گوشت کھانے والی ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں" غرض کیا کچھ نہیں عطا ہوا رحمت للعالمین ﷺ کے توسط سے۔

خاکِ طیبہ ٹرسٹ کی مناسبت سے میں مضمون کے اختتام پر علامہ اقبالؔ کی اس پر عقیدت کو ثبت کرتا ہوں

تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی
جس کے دامن میں پناہ اقوامِ عالم کو ملی

مولانا ابوالکلام آزاد: ایک شخصیت کئی کارنامے

(یہ مقالہ ہندوستانی قونصلیٹ (جدہ) میں پڑھا گیا تھا۔)

یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ جب سے انسانی ذہن شعور سے آشنا ہوا اور مزاجِ بنی آدم تہذیب سے متعارف ہوا اس وقت سے تا دمِ تحریر و تقریر بے شمار افراد تاریخ کی سنہرے صفحات کی زینت بنتے رہے ان کا نام اور ان کے کارنامے سونے کے حروف اور تحریز زریں سے لکھے جاتے رہے لیکن ایسے افراد اور ایسے اولوالعزم اشخاص کی تعداد بہت کم ہے جنہوں نے اپنے کارناموں سے اپنی فکر و عمل سے، اپنی خداداد صلاحیت سے تاریخ کے ابواب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا، ایک نیا chapter کھولا۔ اور ہمیشہ کے لئے ایک مستقل عنوان بن گئے۔

اس بزم کو سجایا گیا ہے اس عظیم شخصیت کے لئے اس محفل کو ترتیب دیا گیا ہے اس فرزندِ ہندی کے لئے جس کو دنیا ابوالکلام آزاد کے نام سے جانتی ہے۔

کون جانتا تھا، کسے خبر تھی اور کس کو معلوم تھا کہ ۱۸۸۸ء میں مکہ مکرمہ میں پیدا ہونے والے اس بچے کا نام جب محی الدین تجویز کیا جارہا تھا تو وہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ اور محی الدین نام کے اس بچے کا نصیب اہل دین کو بیدار کرنا اور ان کے دینی شعور کو فکر و عمل کی صحیح راہ بتانا قرار پایا۔

محی الدین یعنی جاگرتی پیدا کرنے والا اور زندگی کی صداقت اور حقیقت کا شعور پیدا کرنے والا غرضیکہ لفظ محی الدین اپنے اندر اتنی گہرائی اور وسعت رکھتا ہے کہ اس کو بیان کرنا میرے زورِ بیاں اور سرحدِ اِدراک سے پَرے ہے۔

وقت مختصر اور عنوان انتہائی جامع۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کا ذکر کروں، کس کا احاطہ کروں اور کس کو زبان و بیان کی قید سے آشنا کراؤں۔ محی الدین ایک داستان نہیں ایک تاریخ ہے۔ جس کے عنوان روز بروز بڑھتے ہی رہتے ہیں اور عجیب و غریب شخصیت کی کیفیت کو اقبال

کے الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے،

اس ذرے کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم
یہ ذرہ نہیں شاید سمٹا ہوا صحرا ہے

اس ہندوستان کے بیٹے محی الدین ابوالکلام آزاد نے اس متحدہ ہندوستان کی تقسیم کی زبردست مخالفت کی ۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جامع مسجد دہلی سے ایک زبردست ہجوم سے وہ یوں مخاطب تھے ''عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو وہ جس طرح آج سے کچھ عرصے پہلے تمہارا جوش وخروش بے جا تھا اسی طرح آج یہ تمہارا خوف وہراس بھی بے جا ہے، مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے، سچے مسلمانوں کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔

ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور ہم ان صفحوں میں زیبِ عنوان بن سکتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لئے تیار بھی ہوں۔

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لئے تیار نہ تھے بلکہ اب تیار ہوجاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے ہیں لیکن سورج تو چمک رہا ہے اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہی۔

اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لئے تیار نہیں تو پھر تمہیں کوئی طاقت بہکا نہیں سکتی، آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے ہم اس کے لئے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہینگے''۔

اپنی تقریر کو ختم کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا

''اور بار بار کہتا ہوں، اپنے حواس پر قابو رکھو اپنے گرد وپیش اپنی زندگی خود فراہم کرو، یہ منڈی کی: چیز نہیں

کہ تمہیں خرید کرلا دوں یہ تو دل کی دکان ہی میں سے اعمالِ صالحہ کی نقدی دستیاب ہوسکتی ہے''۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے جس وصفِ اعلی نے مجھے سب سے زائد متاثر کیا وہ ہے ان کا ایمان ویقین اس فرمانِ ربی پر''وما ارسلناک الا رحمة للعالمین''

''اے پیغمبر ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام عالم کے لئے رحمت قرار دے کر''صحرائے عرب کے مقدس شہر مکہ مکرمہ میں پیدائش ہوئی اور پھر یہ مشتِ خاک وسعت کی ہوس میں اپنے وطن ہندوستان جنتِ انساں میں جلوہ گر ہوئی، کلکتہ میں ان کے والد مولانا خیرالدین کا قیام وسکونت تھی، عربی فارسی اور اردو کی وہ علوم جس کی تحصیل کے لئے برسہا برس کاوش، مشقت ومحنت لازم ہوتی ہے اس کو ابو الکلام نے بفضلِ رب انتہائی مختصر مدت میں پایۂ تکمیل تک پہونچا دیا خود لکھتے ہیں کہ''عمر کا وہ حصہ جب دوسرے اپنی کمر کے پٹکے سفر پر نکلنے کے لیے کستے ہیں اس عمر میں اپنی منزل پہ پہونچ کر میں اپنے پٹکے کھول رہا تھا''، سچ ہے:

سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے مولانا آزاد کے بارے میں ایک جگہ تحریر فرمایا کہ مولانا آزاد کے مخالفین بھی ان کی غیر معمولی ذہانت، خداداد حافظہ، خودداری، اور خود اعتمادی کے نمایاں اوصاف پر متفق تھے۔

مولانا آزادؒ کی طلسماتی شخصیت کا ذکر مولانا علی میاں کے الفاظ میں

''بلند قد وقامت جس کو سروآزاد کہنا ہر طرح موزوں ہوگا۔ کتابی چہرہ جس میں سرخی جھلکتی ہوئی آنکھیں روشن وفراخ، متبسم پلکیں، متکلم پیشانی سے خود اعتمادی اور بلند طالع نمایاں، لباس خالص دہلی ولکھنؤ کے شرفاء، بلکہ روساء کا سا، سادہ لیکن حسن مذاق اور نستعلیق ہر چیز سے عیاں، ٹوپی ذرا بلند جس میں ان کی انفرادیت جوان کی ذات کا جوہر بن گئی تھی نمایاں، پاؤں میں سلیم شاہی

جو تا، یہ تھے مولانا ابوالکلام آزادؔ‘‘۔

یہ تھی ان کی ظاہری شخصیت لیکن ان کے جن اوصاف نے نہ صرف ان کو اپنے ہم عصر علماء اور سیاست دانوں سے ممتاز و ممیّز کیا اور وہ ہمیشہ منفرد اور تنہا دکھائی دیئے بلکہ تاریخ کی اہم شخصیات کے مقابل بھی مولانا کا انفرادی تشخص اور ان کی (Personality) نمایاں ہی رہی۔

یہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ ہندوستان کے ایک بیٹے محی الدین نے متحدہ ہندوستان کا خواب دیکھا اور اس کو اس کی تعبیر بھی ملی، کشمیر سے راس کماری تک بحرِ عرب سے خلیج بنگال تک ایک ہندوستان اور یہاں کے رہنے والے سب کے سب ہندوستانی اور پھر یہی خطہء جنت نشان دنیا کے نقشے پر ہندوستان کہلایا۔

چنانچہ اس ضمن میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ کے ایک جلسے میں ہندو، مسلم اتحاد پر تقریر کرتے ہوئے مولاناؒ نے سنن ابی داوٗد شریف کی ایک حدیث کا حوالہ دیا کہ رسول اللہ ﷺ کو آخر شب میں اپنے رب سے جو سرگوشیاں اور دعا و مناجات کرتے ہوئے سنا گیا اس میں ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا۔

’’انا شهيد ان العباد كلهم اخوة‘‘ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سب بندے بھائی بھائی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مولاناؒ صرف مسلمانوں کے بارے میں نہیں سوچتے تھے بلکہ اللہ کے بندوں کے بارے میں سوچتے تھے اور وہ ہندوستانی تھے اس لئے ہندوستانیوں کے بارے میں پہلے سوچتے تھے۔ ستمبر ۱۹۳۸ء کو کلکتہ میں اہلِ حدیث کے ایک جلسہ میں مولانا نے فرمایا:

’’اس سے زیادہ شرم کی اور کیا بات ہو سکتی ہے جو یورپ اور امریکہ میں تبلیغ کا خواب دیکھ رہے ہیں وہ اپنی ہمسایہ قوم کو اب تک نہیں سمجھا سکے پھر یہ کس درجہ شرمناک ہے کہ تم سے اب تک اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے اللہ کے پیغام کو دینِ فطرت کی تعلیم کو دنیا کی سب زبانوں میں نہ سہی تو کم از کم ملک

کی زبان میں اہلِ ملک تک پہنچا سکو۔

بتاؤ تم نے کتنے مستند ترجمۂ قرآن ملک اور اہلِ ملک کے سامنے پیش کئے ہیں''

مولانا آزاد نے بحیثیت صدر کانگریس اپنی تقریر میں کہا تھا کہ

''میں سو سال تک سوراجیہ کا انتظار کرلونگا لیکن ہندو مسلم نفرت نہیں پیدا کرونگا''۔

یہ تھے ابوالکلام جو ایک ایسا بلند مینار تھے جس کی تعلیمی بنیاد بہت گہری تھی وہ تعلیم کی اہمیت اور اس کی طاقت سے بخوبی واقف تھے۔اس لئے آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستانی تعلیمی معیار کو دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے معیارِ تعلیم کے مقابل کھڑا کردیا۔

Univrersity Grant Comission

Indian Institute Of Technology

Indian Institute Of Fine Arts

ان سب کو Organize اور قائم کرنے میں مولانا کی علمی بصیرت اور Super Vision کا دخل تھا۔

وہ ایک ایسے پیر مغاں تھے جو سخت سے سخت حالات اور طوفانی حوادث میں بھی نہ روئے اور نہ گریہ کناں ہوئے بلکہ مردانہ وار حالات کا مقابلہ کرتے رہے اور ان کے جیسے نہ جانے کتنے عظیم مجاہدین کی بدولت ہم کو آزادی ملی۔

مولانا ابوالکلام آزاد جیسی عظیم شخصیت کو نذرانہ عقیدت اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہوں

جو قوم کا رہبر تھا وہی پیر مغاں تھا
مینارۂ عظمت کا وہی زندہ نشاں تھا
طوفانِ حوادث پہ نہیں گریہ کناں تھا
اغیار سے لڑتا ہوا منزل کو رواں تھا

جان کینڈی

شائع شدہ دنیا نیوز میگزین، لکھنؤ۔ (۲۸ر نومبر ۱۹۶۳ء)

قادرِ مطلق کا یہ حکمِ قطعی ہے کہ جو ہستی بھی اس جہان آب و گل میں آگئی وہ ضرور بالضرور موت سے ہمکنار ہو۔

کل نفس ذائقة الموت

لوگ پیدا بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی رہتے ہیں۔ پیدائش سے خوشی و مسرت کی گھٹائیں بھی اُمڈتی ہیں اور موت سے رنج وغم کے بادل بھی چھا جاتے ہیں۔ پیدائش اس درجہ اہمیت نہیں رکھتی جتنی کہ موت۔ پیدا ہونے والا اپنی موت بھی مرتا ہے اور قتل وشہید بھی کیا جاتا ہے۔ لیکن وہ قتل کس درجہ بھیانک ہوتا ہے جس کے نتیجہ کے طور پر ہمارے درمیان سے کوئی جواں سال، مدبر، دانشمند اور ذہین ہستی اُٹھ جاتی ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض افراد کی پیدائش اس کی پوری قوم میں خوشیوں اور مسرتوں کی انگنت لہریں پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعض افراد کی موت، اور موت بھی کیسی؟ جو نا گہانی ہو۔ محض اُس کے رشتہ داروں، مخصوصین اور قوم ہی کے لیے نہیں، بلکہ اقوامِ عالم کے لیے ایک سانحہ بن جاتی ہے۔

موت کا غم ایک تو یونہی جانگداز ہوتا ہے لیکن جب ایسی جلیل القدر ہستیاں، جنکی تخلیق میں نقاش فطرت صدیاں گذار دیتا ہے۔ سالہا سال تک جن کے جوہر نکھارے جاتے ہیں، برسہا برس تک جن کے کردار کی آزمائش ہوتی ہے۔ کسی سر پھرے نادان اور پاگل کے ہاتھوں سے موت کے ہمکنار ہوتی ہے تو ان کی موت سارے جہاں کے لیے ایک حادثہ اور سانحہ بن جاتا ہے۔ کسے خبر تھی، کون جانتا تھا کہ کس کو معلوم تھا کہ کاتب تقدیر نے ۲۳ر نومبر ۱۹۶۳ء کی شب کے لیے ایک

ایسے حادثہ کو قلم بند کر دیا ہے جس کا تعلق محض ایک قوم سے نہیں ہوگا، بلکہ تقریباً سارے جہاں کے انسان اس حادثہ سے گرویدہ اور رنجیدہ ہو جائیں گے۔ ہمارے ہندوستانی وقت کے مطابق ۲۳ر نومبر ۶۳ء کی شب کو ۱۲ بج کر ۵ منٹ پر حادثہ کی پہلی منزل کا آغاز ہوتا ہے اور ۳۰۔۱۲ پر حادثہ اپنے پورے عروج اور کمال پر تھا۔ یعنی امریکہ جیسے عظیم ملک کا جواں سال مدبر اور دانشمند صدر جان فٹز جیرالڈ کینڈی ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا۔ موت کی گرفت اس قدر سخت تھی کہ گولی لگنے کے بعد انہیں ہوش ہی نہ آیا۔ بے ہوشی کے عالم میں ۲۵ رمنٹ گذار کر اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا　　　　ہم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے

جان کینڈی امریکہ کے ۳۵ رویں صدر تھے۔ عیسائیوں کے رومن کیتھولک فرقے سے تعلق رکھنے والے امریکہ کے پہلے صدر جان کینڈی امریکہ کے چوتھے صدر تھے جنھیں دورانِ صدارت ہی قتل کیا گیا۔ سب سے پہلے مقتول صدر ابراہم لنکن تھے جنہیں ۱۸۶۵ء میں ہلاک کیا گیا۔ گارفیلڈ اور میکا نلے، کو بھی دورانِ صدارت میں قتل کیا گیا۔

۲۹ رمئی ۱۹۱۷ء کو بوسٹن کے نواحی علاقہ میں جان فٹز جیرالڈ کینڈی نے جنم لیا۔ ان کے والد جوزف کینڈی، اسٹاک اکسچینج کمیشن کے چیرمئن رہ چکے ہیں۔ آپ کی والدہ روز فٹز جیرالڈ کینڈی بوسٹن کے سابق میئر کی صاحبزادی ہیں۔ جان کینڈی کی ابتدائی تعلیم کا آغاز بوسٹن کی اسکول سے ہوا۔ اُس کے بعد وہ لندن اسکول آف اکنامکس میں داخل ہو گئے۔ تعلیم مکمل کر کے وہ فوج میں بھرتی ہو گئے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران خود آپ کی درخواست پر آپ کو بحر الکاہل کے علاقہ میں متعین کر دیا گیا۔ فوجی لحاظ سے انہیں فرسٹ رینک دیا گیا اور ایک تار بیڈ و لانچ اُن کے کمان میں تھی۔ جان کینڈی کی جرأت مندی کا پہلا کارنامہ دنیا کی نظروں میں اس وقت آیا جب دوسری

جنگ عظیم کے دوران ۱۲/اگست کو ایک جاپانی تباہ کن تیارہ نے بُنکی لانچ کو بم سے اُڑا دیا۔ خود زخمی ہونے کے باوجود جان کینڈی نے اپنے تقریباً تمام ساتھیوں کی جان بچائی۔ نقاشِ فطرت نے جن جوہر کو نکھارنے میں صدیاں لگائیں تھیں، اُس کا یہ پہلا نمونہ تھا۔

جنگ عظیم کے بعد چند مہینے بحیثیت جرنلسٹ گذارے۔ ۱۹۴۸ء میں امریکہ کے ایوان نمائندگان کے لیے بوسٹن کے حلقہ سے منتخب ہوئے۔ یہ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز تھا۔ ۱۹۵۲ء میں پھر چن لیے گئے۔ ۱۹۵۶ء ڈیماکریٹک پارٹی کے نمائندے کی حیثیت سے امریکی نائب صدر کے انتخاب کے لیے نامزد ہوتے ہوتے رہ گئے۔

ستمبر ۱۹۵۶ء میں جان کینڈی کی شادی ۲۹/سالہ جیکو لائن سے ہوئی۔ مسز جیکو لائن کینڈی کے والد نیویارک کے ایک مشہور بینکر ہیں۔ مسز کینڈی نے ۱۹۵۱ء جارج واشنگٹن یونیورسٹی سے گریجویٹ کی ڈگری حاصل کی اُس کے بعد واشنگٹن ٹائمس ہیرالڈ میں کیمرہ گرل ہوگئیں۔

اُسی دوران اُن کی ملاقات جان کینڈی سے ہوئی۔ اُن کے یہاں ۳ بچے ہوئے پہلی لڑکی کیرولائن ۱۹۵۷ء میں پیدا ہوئی۔ دوسرا لڑکا جان فیٹر جیرالڈ جونیئر ۱۹۶۰ء میں ہوا۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں قبل از وقت ایک بچہ کی ولادت ہوئی لیکن پیدائش سے چند گھنٹوں بعد ہی وہ مرگیا۔

جان کینڈی ڈیماکریٹک پارٹی کے نمائندے کی حیثیت سے ۱۹۶۰ء کے عام انتخاب میں امریکہ کے صدر کے عہدہ کے لیے کھڑے ہوئے۔ ۸/نومبر ۱۹۶۰ء کو نتیجہ کے عام انتخاب میں امریکہ کے صدر کے عہدہ کے لیے کھڑے ہوئے۔ ۸/نومبر ۱۹۶۰ء کو نتیجہ کا اعلان ہوا اور جان کینڈی کو امریکہ کا سب سے کم عمر صدر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

۲۰/جنوری ۱۹۶۱ء کو عہدہ کا حلف اُٹھایا اور ۲۳/نومبر ۶۳ء کو جب وہ ڈیلاس کے تجارتی مرکز ٹکساس میں خیر مقدم کرنے والوں کے درمیان سے ایک کھلی کار میں گذر رہے تھے۔ ۲۴/سالہ

اوسوالڈ نے انہیں دوربین لگی رائفل سے گولی کا نشانہ بنا دیا۔ گولی لگنے کے ۲۵ منٹ بعد ہی جان کینڈی اس دارِفانی سے کوچ کر گئے ۔ مانا کہ جان کینڈی ہمارے درمیان نہیں، اُنکے جرأت مندانہ اور دانش ورانہ کارنامے جو انہوں نے اپنی اس مختصرسی ۴۶ ر سالہ زندگی میں انجام دیئے۔ رہتی ''دنیا '' تک لوگوں کی زبان پر رہیں گے اور آنے والا مورخ کبھی اُن کے نام کو نظر انداز نہیں کریگا۔

جان کینڈی کی موت کا غم محض ان کی قوم تک محدود نہیں رہا، بلکہ تقریباً تمام اقوامِ عالم میں رنج وغم کی لہر دوڑ گئی۔ برطانیہ کے سابق وزیر اعظم سر ونسٹن چرچل نے اُن کی موت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا: ''اس بیمانہ اقدام سے ایک زبردست مدبر عقلمند اور جری شخص ہمارے درمیان سے اُٹھ گیا۔ اس واقعہ سے امریکہ ہی کو نہیں بلکہ ساری دنیا کو نا قابل تلافی نقصان پہونچا ہے۔''

اور یہ حقیقت بھی ہے لیکن اس مسلمہ حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقش حیات عام اُس کو یوں نہ کر دیتا نظام کائنات

علامہ اقبالؒ

سینچر وار ارکو کیپ کنیاویرال فلوریڈا میں انہیں چاند پر اترنے کے فلائی پروگرام کے متعلق رپورٹ پیش کی گئی تھی۔ اپنے تجسس کی خصوصی عادت کے مطابق انھوں نے راکٹ سٹیرن سی نمبرا کا بھی معائنہ کیا اور اس بات سے بہت اطمینان ہوا کہ اگلے مہینے دنیا کے سب سے بھاری آلات کا بوجھ اٹھا کر آسمان میں داغا جائیگا اور جواب تک داغے گئے راکٹوں میں دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور راکٹ ہوگا۔

سوموار کو انھوں نے ان لڑاکا فوجوں کی چھاونی دیکھی جو دنیا میں کسی بھی جگہ امن کی برقراری یا لڑائی کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے فوراً ہی فوج بھیج سکتی ہے انھوں نے تمپا اور میامی بیچ کی

تقریروں میں اپنے ملک کے اندر اور باہر مضبوطی، آزادی اور مساوی مواقع پر زور دیا۔ اس کے بعد وہ اس محنت طلب اور کٹھن پروگرام اور سفر کے دوران میں بھی سرکاری کام اور معاملات نبھاتے رہتے۔ اس کے ساتھ ہی وہ دوسروں میں اپنی دل چسپی بھی برقرار رکھتے اور لوگوں کو اپنے مزاج اور خوش طبعی سے ہنساتے رہتے۔ ڈلاس کو جاتے ہوئے ہوائی جہاز پر انھوں نے اپنی تقریر میں نظر ثانی کی۔

اپنی اس تقریر میں جو وہ کبھی نہ کر سکے آخر میں لکھا تھا۔ اور یہی الفاظ ان کے کتبے میں استعمال ہو سکتے ہیں۔ ''ہم اس ملک میں رہنے والے اس پشت میں اپنی مرضی کے مقابلے میں حالات و تقدیر کی وجہ سے عالمی آزادی کی دیواروں پر نگہبان کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اس لئے ہم دُعا کرتے ہیں کہ ہم اپنی طاقت اور ذمہ داریاں نبھانے کے قابل ہو سکیں تاکہ ہم اپنی طاقت کو دانشمندی کے ساتھ استعمال کر سکیں۔ اور یہ کہ ہم اپنے ہی وقت میں ہمیشہ کے لیے دنیا میں امن اور لوگوں کے خیر سگالی کے قدیمی خواب پورے کر سکیں۔ ہمارا ہمیشہ یہی نصب العین ہونا چاہیے اور ہمارے مقصد کی پاکیزگی ہمیشہ ہماری طاقت کی تہہ میں کارفرما ہونی چاہیے۔ کیونکہ جیسا کہ مدتیں گزریں بائیبل میں کہا گیا ہے:۔۔۔ ''خدا کے سوا کوئی شہر کا محافظ نہیں۔ یہ نگہبان بے سود جاگتے رہتے ہیں۔''

راشد صدیقی: ایک طویل رفاقت

کسی کے بارے میں کچھ کہنا بہت ہی آسان لیکن کسی کے بارے میں وہ کہنا جس کا وہ حقدار ہے اور اہل ہے بہت ہی دشوار اور بہت ہی مشکل اور یہ یہی میرا اور راشد بھائی کا معاملہ ہے۔اب کس واقعہ کا ذکر کروں اور کس بات کو الفاظ کا جامہ پہناؤں، خیالات ہیں کہ تواترے ،امڈ آرہے ہیں اور الفاظ قطار در قطار صف بستہ نظر آرہے ہیں۔

راشد بھائی کی شخصیت درحقیقت یک رنگی نہیں بلکہ گنگا جمنی ہے چنانچہ اس مختصر مقالے میں ان سب کا احاطہ کرنا اور ہر پہلوئے طرحدار کا ذکر کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ تقریباً ناممکن ہے اور پھر راشد بھائی سے ہماری شہریاری بھی ہی ایک زمانے کی واقفیت اور ایک عمر کا ساتھ ہے یہ وجہ ہے کہ جب بھی کچھ لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں تو ان کی مرنجاں مرنج شخصیت ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ پردۂ افکار پر نمودار ہو جاتی ہے۔آپ اس جلوۂ ادب نواز کی جلوہ گری سے لطف اندوز ہوں یا اس شاعرِ طرحدارئی باغ و بہار شخصیت کی بارے میں مودبانہ سوچنا بقول فراقؔ گھورکھپوری

تم مخاطب بھی ہو، قریب بھی ہو
تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں

اب کیا کہوں کیسے ہیں؟ اور کیسے ہیں ان کے انداز، وہ سرکاری تقریبات ہوں یا ادبی محافل یہ زینتِ محفل بھی بنے اور رونقِ بزم بھی رہے لیکن دیکھنے والوں نے سننے والوں سے یہی کہا کہ الگ تھلگ رہتے ہوئے بھی راشد بھائی ہر نظر کا محور اور ہر شریکِ محفل کی توجہ کا مرکز بنے رہے گویا۔۔۔ع

انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو
شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

محمد راشد علی صدیقی آج سے تقریباً ۳۶ سال پہلے محض ایک فردِ واحد کا نام تھا جس کو دنیا شیخ صادق علی صدیقی رئیس قصبہ بجنور کے فرزندِ ارجمند کی حیثیت سے جانتی تھی لیکن اسی راشد علی صدیقی کو اقارب کی عنایت خاص، احباب کی نوازش وکرم اور گردشِ دوراں وافکارِ پریشاں نے چمن زار اودھ سے اس صحراو بیاں میں پہونچادیا۔

گوکہ ایک طویل عرصہ سے یہاں مقیم ہیں لیکن ایک لمحے کے لئے بھی نہ تو یادِ وطن دل ودماغ سے محو ہوئی اور نہ خاکِ وطن نظروں سے اوجھل، موضوع گفتگو سے بھٹکنے اور بہکنے والے بے شمار افراد ملے۔ لیکن راشد بھائی جب بھی بھٹکتے اور بہکتے ہیں تو اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز ہوتے ہیں۔ وہی کاکوری اور اسی لکھنو کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اور پھر پُرانی یادوں میں اسے محو اور مگن ہو جاتے ہیں کہ ایک مدہوشی سی طاری ہو جاتی ہے۔ بس بولتے ہی رہتے ہیں نہ زبان تھکتی ہے اور نہ خیالات کا تسلسل ٹوٹتا ہے گویا یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔

پھر دیکھئے اندازِ گل افشانی گفتار
کردے جو کوئی ذکرِ وطن آپ کے لئے

لکھنو جو کبھی اپنے عہدِ شباب میں ہر صاحبِ فکرونظر کا فردوسِ تصور تھا اس نگری کے سخن ور ہوں کہ سخن فہم، فاتح قلب ونظر ہوں کہ منتخبِ روزگار تھے کہنے والے نے مٹی کا حق یوں بھی ادا کیا ہے۔

پوشیدہ تیری خاک میں ذراتِ حسیں ہیں
جگنو نہیں تارے نہیں یہ ماہِ مبیں ہیں
دلگیر بھی دلدار بھی یہاں زہرہ جبیں ہیں

لکھنوی تہذیب ومعاشرت کی نفاست ونزاکت نے بے شمار نگری بستی اور قصبات کو متاثر کیا جس میں رودولی شریف اور کاکوری شریف سرِ فہرست ہیں۔

کاکوری لکھنو کے مضافات کا وہ تاریخی قصبہ ہے جو شاہ حبیب حیدر قلندر اور نہ جانے کتنے صوفیائے کرام کی آخری آرام گاہ ہے۔ نہ جانے کیسے کیسے پیرِ کامل اور رہنمائے وقت اسی خاک سے پیدا ہوئے جو علم وادب اور شعروفن کے افلاک پر نمایاں مقام واہمیت کے حامل رہے۔ دنیا جانتی ہے اور سب کو خبر ہے کہ اسی خاک سے اردو شعروادب کے اس محسن کا بھی تعلق ہے، جس کی چشمِ تصور نے یہ بھی مشاہدہ کیا تھا کہ

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل

کیا دور تھا وہ بھی جب سب کے سب ایک ہی انداز میں ڈھلے ہوتے تھے اور ایک ہی مزاج کے آئینہ دار تھے۔ وجہ سادہ مختصر یعنی اسلاف کی تقلید اور انکے فیض حاصل کرنے کا جذبہ اور لگن چناچہ قیسؔ کاکوروی فرماتے ہیں؛

قیسؔ کی تقلید کا جب تک تھا صحرا میں رواج
جتنے دیوانے تھے سب کا ایک یہی انداز تھا

اور شاید یہی وجہ ہے کہ کاکوری کا احتراماً ذکر کرنے والے راشد صدیقی کی ولادت ۱۹۳۴ء میں کاکوری میں ہوئی۔ گو کہ بچپن لڑکپن اور عہدِ شباب لکھنو کے کوچہ وبازار میں گذرا لیکن آپ نے اصل کو ہمیشہ یاد رکھا اور اپنی مٹی سے وارفتگیٔ محبت کے اظہار میں کبھی بھی ندامت نہیں محسوس کی لیکن انکو اہلِ لکھنو کی حدبندی کا ہمیشہ احساس رہا۔ کبھی کبھی دبی زبان سے اظہارِ حقیقت بھی کردیتے ہیں۔

پیدا تو ہوا کاکوری میں لکھنوی بنوں کیسے راشدؔ
یہ بات ہمیشہ محفل میں غزلوں کو سنا کر دیکھی ہے

راشد صدیقی کو ایک خاص ادبی شرف حاصل ہے جو بہت کم اہلِ لکھنو اور بالخصوص اہلِ ادب کو نصیب رہا۔ مولانا صفیؔ لکھنوی آپ کے استادِ محترم تھے اور شاید انکے حضور زانوئے ادب تہ کرنے کا یہ فیض

ملا کہ اپنی زندگی کہ ہر دور میں راشد بھائی نے آپکو مستعد اور سرگرم عمل میں رکھا۔ ڈھلتی ہوئی دھوپ میں بھی چڑھتے ہوئے سورج کا انداز اختیار کیا اور زبانِ حال سے ان کی زبان پر استاذ صفی لکھنوی کا یہ فرمان ہمیشہ جاری رہا۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

وہ برس پندرہ یا سولہ کا سن نہیں تھا بلکہ راشد بھائی کی صرف بارہویں سالگرہ ہوئی تھی جب انہوں نے میدانِ ادب میں اپنی آمد کا اعلان کر دیا تھا ذرا اس کم عمری کے اندازِ حوصلہ ملاحظہ فرمایئے

میری جرات کی لاج رکھ لینا
یہ خطا پہلی بار کرتا ہوں

شاعری میں باقاعدہ درسِ اصلاح مولانا منظر لکھنوی سے حاصل کیئے، اپنے استاذ مولانا منظر لکھنوی کے ایک شعر کو اکثر گنگاتے ہیں۔

شمع کا ذکر اور میرے سامنے
کیا جلی اک رات جل کر رہ گئی

گویا اس طرح دل کے پھپھولے اپنے ہی سینے کے داغ سے جلاتے رہتے ہیں۔

زبانِ اردو کو بہ حیثیت مضمون انہوں نے صرف ہفتم تک پڑھا اور جراتِ شاعر تو ملاحظہ فرمایئے کہ خود اپنے الفاظ میں محافل میں اس کا ذکر بھی کرتے ہیں:۔

میری بولی تو وہی ہے جو بولتے ہیں گھر والے
اردو تو فقط ہفتم تک ہی بس میں اٹھا کر دیکھی ہے

۱۹۵۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی نے جشن زریں کا اہتمام کیا دھوم دھام تھی اور راشد صدیقی وہ پہلے مسلم

طالب علم تھے جن کا انتخاب بہ حیثیت کنوینر ہوا تھا۔ اور آج بھی اس پُرشکوہ جشن کہ یاد اس دور کے افراد کے ذہن میں جگمگا رہی ہے۔ اس دور کے تقریباً تمام مشاہیر شعراء نے اس یادگار مشاعرے کو رونق بخشی تھی: آرزوؔ، صفیؔ، ذکیؔ، ظریفؔ، عزیزؔ، جوشؔ، جگرؔ، حسرتؔ، سیمابؔ، شکیلؔ، غرضکہ کس کس کا ذکر کروں بس یوں سمجھئے کہ ادبی کہکشاں لکھنؤ کے اس دریچہ میں جگمگا رہی تھی۔

اس دور کے ایک یادگار واقعہ کا ذکر بڑے حوصلہ اور اعتماد سے کرتے ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں الہ آباد میں مشاعرہ تھا۔ سب بڑے شریکِ مشاعرہ تھے۔ راشد صدیقی بھی اس مشاعرے کے ایک شاعر تھے لیکن مبتدی ڈائس پر ساحر لدھیانوی کے پاس بیٹھے تھے۔ راشد بھائی نے ساحرؔ صاحب سے آٹوگراف کی فرمائش کی تو ساحر صاحب نے فرمایا کہ اس کی کیا ضرورت ہے پھر اپنا ایک شعر تحریر فرمایا

لے دے کے اپنے پاس فقط ایک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم

راشد صدیقی نے بتایا کہ وہ دن اور آج کا دن یہی شعر ان کا مطمحِ نظر اور نصب العین ہے۔ باوجود کہ معترضین کا ہجوم اور ناقدین کا انبوہ ان کی فکر و نظر کی حوصلہ شکنی پر ہمیشہ آمادہ رہا لیکن انہوں نے اس معاملے میں اپنی نظر کو جھکایا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صفیؔ اور منظرؔ لکھنوی کے شاگرد ہونے کے باوجود راشد صدیقی اپنی وسیع النظری اور وسیع القلبی کا ثبوت دیتے ہوئے دوسرے لب ولہجہ کے مشاعرہ میں بھی خوشدلی سے شریک ہوتے رہے، کیونکہ شادؔ عظیم آبادی نے اپنی انفرادیت کے باوجود دوسروں کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ شاد صاحب فرماتے ہیں

کچھ اور ہے اربابِ سخن کا لب ولہجہ
دھوئی ہوئی کوثر سے زبان اور ہی کچھ ہے

راشد بھائی نے اپنے عہد شباب کے مشاعروں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ سب سے زائد اس دور میں جو باتیں متاثر کن تھیں وہ شعراء کا لباس، انداز و اخلاق، پھر متاسفانہ انداز میں بولے کہ ''بھیا اب وہ بات نہیں، اب مشاعروں میں زیادہ تر پڑھنے والے آتے ہیں۔شاعر بہ اندازِ شاعر بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔'' اپنے طالب علمی کے دور میں راشد بھائی اپنی قومی نظموں کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے۔اودھی زبان کے اس رس کہ وجہ سے یہ صرف کوچہ و بازار ہی میں نہیں بلکہ پگ ڈنڈی اور کھلیان میں گنگنائے جاتے تھے، ایک انداز یہ بھی تھا۔

صحراؤں ما پھول کھلے ہیں
گلشن ما انگارے
بگین جا انسان لے ہیں
شہرن میں بنجارے

ان کو اس بات کی شدید تکلیف ہے کہ اردو صرف جگمگاتے شہروں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔وہ چاہتے ہیں کہ اردو عوام میں مقبول ہو اور عوام کی اکثریت گاؤں اور دیہات میں رہتی بستی ہے۔ ساحر لدھیانوی کو وہ اسی وجہ سے بہت پسند کرتے ہیں کہ انہوں نے ہندی کے بے شمار الفاظ اپنی اردو شاعری کے ذریعہ مروج کئے

یوں تو ہر تخلیق کار کو اپنی ہر تخلیق محبوب و عزیز ہوتی ہے لیکن پھر بھی اس فہرست میں سرِ فہرست ایک ہی تخلیق ہوتی ہے راشد صدیقی اس کی نشاندہی کرتے ہیں۔

فن کے لئے لازم ہے میاں اک فکر رساں کچھ اس کی عطا
شمشیر وگرنہ عالم میں بہتوں نے چلاکر دیکھی ہے

راشد بھائی فطرتاً ایک شاعر لیکن حقیقتاً وہ ایک اولوالعزم انسان ہیں۔دسمبر ۱۹۶۴ء میں جدہ بہ حیثیت

تاجر تشریف لائے اور تیسرے ہی دن جناب مصطفیٰ علی قدوائی کے دولت کدہ پر ایک طرحی مشاعرہ میں شرکت فرمائی غزل پڑھتے ہی ساکنانِ برصغیر کو احساس ہوگیا کہ ایک اور شاعر شریکِ بزم ہوگیا ہے، جن شعراء کی منظومات رائج المشاعرہ تھیں اسمیں سرفہرست جناب احمد جمال صادق، عطا اللہ فاروقی، عبدالرحیم انصاری، ہاشم رضا، مولانا فرید الوحیدی وغیرھم اہم تھے۔ راشد صدیقی دبے پاؤں انکی محافل میں داخل ہوئے اور پھر اپنے منظوم سکے کو بھی رائج المشاعرہ تسلیم کرالیا۔

جولائی ۱۹۶۶ء سے ایک بین الاقوامی کمپنی RAYTHEON سے منسلک ہیں اور سرخروئی کے ساتھ کنارہ کشی اختیار کررہے ہیں اس دوران کچھ نہ کچھ کاروبار بھی کرتے رہے۔ جس میں سود وزیاں کی چاشنی لذت اور تلخی سے بھی آشنا ہوتے رہے۔ لیکن احساسِ شکست سے کبھی مغلوب نہیں ہوئے۔ بقول اقبالؒ

جو سختیٔ منزل کو سامانِ سفر سمجھے
اے وائے تن آسانی ناپید ہے وہ راہی

ان کے بلند عزائم کے نتائج کی جھلک کئی محاذ پر دکھائی دیتی ہے۔ شمیم جے پوری مرحوم سے ہمیشہ انکا ربطِ خاص رہا۔ اس لیے شمیم میموریل سوسائٹی کی تشکیل فرمائی۔ ڈاکٹر فاروقی کی وجاہت اور جناب شریف کی شرافت نے جملہ اہلِ ذوق کو عمدہ اور مراتب کے جھمیلوں سے آزاد رکھا۔ حقیقتاً یہ سوسائٹی ایک صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے۔ نو ماہ کی مختصر مدت میں تین کامیاب مشاعرے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اور آج شمیم جے پوری کی پہلی برسی کے موقعہ پر شائقینِ ادب سرحد کی بندش اور پابندی کو نظر انداز کرکے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ راشد بھائی نے لکھنؤ میں International Institute of Special Education بھی قائم کیا ہے۔ جہاں ایم سی اے اور ایم بی اے کی تعلیم بھی دی جاتی ہے، اور یہ ڈگری دہلی یونیورسٹی سے بھی تسلیم شدہ ہے گویا جو کام بھی کیا ٹھونک بجا کر کیا۔ لکھنؤ ہی میں انکی تشکیل شدہ Rasphil

Academy کا افتتاح مولانا علی میاںؒ نے فرمایا تھا۔ اردو ماہانہ لاریب کا اجراء لکھنو میں کیا اور خود سرپرست بھی ہیں۔ خمار بارہ بنکوی مرحوم کی ادبی خدمات کے اعتراف میں خمار اکیڈمی کی تشکیل ہوئی اور جناب راشد علی صدیقی کی نامزدگی بہ حیثیت سرپرست عمل میں آئی۔

ان سب کے علاوہ جو سب سے اہم کام کیا وہ یہ ہے معذور بچوں کے لیے لکھنؤ میں اپنی نوعیت کے پہلے مرکز کا قیام ہے۔ اس مرکز کے تحت معذور بچوں کی تعلیمی، طبی اور رہائشی سہولتوں کا اہتمام ہے۔ ایسے ہی اولوالعزم افراد کو دیکھیئے تو اقبالؒ کے الفاظ میں کہنا ہی پڑتا ہے۔

ہوتا ہے مگر محنتِ پرواز سے روشن
یہ نکتہ کہ گردوں سے زمیں دور نہیں ہے

ایک ملاقات میں راشد بھائی نے ایک بہت عمدہ بات کہی کہ ''ہمیشہ یہی کوشش کرو کہ بڑوں کے چھوٹے اور چھوٹوں کے بڑے بن کر رہو۔''

شمیم جے پوریؒ اس جہانِ فانی سے سال بھر پہلے ہی رختِ سفر باندھ چکے تھے، پھر ۱ر مئی کو مشہور و مقبول ناظمِ مشاعرہ ثقلین حیدر لکھنوی اور ۱۵ر مئی کو دابستانِ دکن کے مشہور شاعر سعید شہیدی بھی داغ مفارقت دے گئے اور آج یہ اندوہناک خبر ملی کہ وہ شعلۂ بیاں شاعر جو اغیار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لکھتا تھا۔

سر پر ہوائے ظلم ہے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

اور جس کو دنیا مجروحؔ سلطانپوری کے نام سے جانتی تھی اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ اللہ جل شانہٗ ان جانے والوں کی مغفرت فرمائے اور انہوں نے فروغِ اردو کا جو بیڑہ اٹھایا تھا اسکو ہم سب مل جل کر اٹھائیں، آمین۔

ایسی کئی چنگاریاں خاکستر میں ہیں: اقبال خان صاحب

کس کو خبر تھی کہ جب کشمیری نژاد نومسلم شیخ نور محمد اپنے نومولود بیٹے کا نام ''اقبال'' تجویز کرر ہے تھے تو وہ لمحہ بارگاہ الٰہی میں قبولیت کا ایک خاص لمحہ تھا اور پھر محمد اقبال کا نام یہ بچہ بڑا ہو کر ایسا اقبال منداور بلند اقبال ہو کہ محض اسلامی ادب نہیں بلکہ عالمی ادب کا سرمایہ ثابت ہوا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں علامہ اقبال کی شہرت چہار دانگ عالم میں پھیل جگی تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ برصغیر کے اکثر و بیشتر والدین اپنے بچوں کا نام ''اقبال'' پسند کرتے تھے اور یہ بات صرف مسلمانوں تک محدود نہ تھی بلکہ غیر مسلموں نے بھی اس نام کو بابرکت سمجھا اور اپنے بچوں کے لئے یہی نام پسند کیا مثلاً اقبال سنگھ، اقبال بھگت، اقبال ٹھاکر، وغیرہ وغیرہ۔

شمالی ہندوستان کے مردم خیز خطہ مظفر نگر سے تعلق رکھنے والے محمد صدیق خان نے اپنی اہلیہ بشیرن فاطمہ کے مشورے سے پانچویں اولاد کا نام محمد اقبال خان پسند کیا اور باہمی پسند کی دلیل یہ بیان کی کہ ان کے تین بیٹے شفیق، سرفراز، اور ارشاد خان اور بیٹی بلقیس بیگم باوجود انتہائی خواہش وکوشش کے حصول تعلیم کی طرف راغب نہ ہو سکے تھے اور اپنے والد کے ساتھ زراعت وکاشت میں مشغول تھے جبکہ صدیق خان کی شدید خواہش تھی کہ ان کی اولاد گوہر تعلیم سے مالا مال ہوں، یہی سب سوچ کر انہوں نے ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو پیدا ہونے والے بیٹے کا نام محمد اقبال خان تجویز کیا تاکہ نام کی برکت سے علم کی دولت ان کے خاندان میں بھی آئے۔ نام تو رکھ دیا لیکن گھر کا ماحول نہ تو علمی تھا اور نہ طور طریقے ادبی، اس لئے اقبال خان بھی بستی کے دوسرے بچوں کی طرح مٹر گشتی کرتے رہے لیکن ایک دن وہ اپنے ایک ہم سن ساتھی کے ہمراہ اسکول چلے گئے۔ ان کا وہ ساتھی اسکول میں پڑھتا تھا۔ اقبال خان اس کے پاس بیٹھ گئے ماسٹر نے ایک نیا چہرہ دیکھ کر پوچھا یہ کون

ہے؟ تو اقبال صاحب نے اپنا تعارف خود ہی کرایا کہ میں اس کا دوست ہوں اس بات پر ماسٹر صاحب نے کہا کہ یہ اسکول ہے یہاں دوست اور ساتھی نہیں آتے بلکہ پڑھنے کے لئے بچے آتے ہیں اور اگر تم پڑھنا چاہتے ہو تو کتابیں، کاپیاں، قلم اور پینسل کا انتظام کرو اور اگر یہ نہیں کر سکتے تو روپیہ لاؤ تا کہ اسکول یہ سب ساز وسامان مہیا کرے۔ اقبال خان کلاس سے اٹھ کر باہر آئے تو سوچتے رہے کہ اس ''خطیر رقم'' کا انتظام کہاں سے کیا جائے۔ تقسیم ہند سے پہلے یہ سرمایہ حقیر نہیں بلکہ خطیر سمجھا جاتا تھا۔

اسی ادھیڑ بن میں تمام رات کروٹیں بدلتے رہے پھر یکایک امید کی ایک نظر آئی۔ ان کی والدہ ایک ہانڈی میں سکے ڈالتی رہتی تھیں تا کہ روزمرہ کے اخراجات اسی ہانڈی سے پورے ہوتے رہیں۔ اقبال خان نے رات کے اندھیرے میں اس ہانڈی سے ۵ روپئے نکال لئے۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے ابن ساباء کے لئے لکھا کہ ''پھر اس کو اندھیرے میں روشنی کی کرن نظر آئی جس نے اس کی زندگی کے ہر تاریک پہلو کو روشن کر دیا'' اور شاید ایسی ہی کرن اقبال خان کو بھی دکھائی دی۔ صبح وہ رقم اسکول ماسٹر کو پیش کر دی اس طرح وہ اسکول کی باضابطہ طالبِ علم قرار پائے لیکن اسی شام جب ان کی والدہ نے ہانڈی کا جائزہ لیا تو ۵ روپے کم تھے۔ دوسرے بچوں سے پوچھا گیا لیکن سب نے لاعلمی ظاہر کی اس پوچھ تاچھ کے دوران ان کو شبہ ہو گیا کہ وہ بھی تفتیش کی زد میں آنے والے ہیں چنانچہ وہ گھر سے بھاگے اور ان کے بھاگتے ہی اہلِ خانہ کا گمان یقین میں تبدیل ہو گیا کہ یہ نازیبا حرکت اقبال کی ہے۔ ننھے اقبال خان کہاں تک بھاگتے ایک طرف احساسِ جرم سے پاؤں بوجھل دوسری طرف اطاعتِ والدین سے برق رفتاری، غرضیکہ پکڑے گئے پھر خوب دھلائی ہوئی اور بقولِ اقبال خان وہ ''پٹائی آج تک یاد ہے''۔ لیکن جب انہوں نے چوری کا سبب بیان کیا تو ہر آنکھ پُرنم ہو گئی۔۔۔ اسکول ماسٹر سے تصدیق ہوتے ہی ان کی قدر و قیمت میں روز بروز اضافہ

ہوتا گیا۔اقبال خان نے جب یہ واقعہ بیان کیا تو میں سوچتا رہا کہ ایک وہ بچہ تھا جس نے بیڑی پینے کے لئے چوری کی تھی اور پھر بڑا ہو کر قوم کا رہبر بن گیا تو وہ بچہ جس نے نیک مقصد کے لئے چوری کی تھی اس کے رہبر بننے کے زیادہ امکانات ہیں اور پھر اقبال خان میں مجمع کو اکٹھا کرنے کی بڑی خاص صلاحیت بھی ہے۔

تعلیم کا سلسلہ جب شروع ہو گیا تو اقبال خان نے عزم و ہمت کے سہارے اس کو منقطع نہ ہونے دیا۔تعلیمی مصارف کی ادائیگی میں وہ وقت بے وقت ٹیوشن پڑھا کر ادا کرتے کیونکہ گھر کی معاشی حیثیت مضبوط نہ تھی۔شاید یہی وجہ ہے کہ ان کا سب سے چھوٹا بھائی امیر اعظم بھی تعلیم یافتہ نہ بن سکا۔ٹیوشن وہ ٹھیکے پر پڑھاتے تھے یعنی اگر ان کا شاگرد فرسٹ آئے گا تو محنتانہ لینگے ورنہ کچھ بھی نہیں۔اور ہمیشہ ایسا ہی ہوا کہ ان کے تیار کئے ہوئے گھوڑوں نے سدا میدان سر کیا۔

کالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد یہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی انجینیر نگ کالج کے مقابلے میں شریک ہوئے، منتخب ہوئے اور ۱۹۴۶ء میں وہاں سے فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے۔

اقبال خان اس ضمن میں ایک خاص بات بتائی کہ علیگڑھ کی روانگی کے وقت ان کے مرحوم والد نے ہدایت کی تھی کہ کوشش کر کے ایسے ہوسٹل میں کمرہ حاصل کریں جہاں غیر مسلموں کی تعداد زائد ہو کیونکہ مرحوم کا کہنا تھا عموماً مسلم طلباء تعلیم کی اہمیت و افادیت سے بخوبی واقف نہیں ہوتے اس لئے ابتداءً جستجو و خواہش رہتی ہے پھر مقصدِ تعلیم لیت و لعل کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔چنانچہ انہوں نے کوشش کر کے جمال ہوسٹل میں کمرہ حاصل کیا جس میں ۸۰ طلباء تھے اور مسلم طلباء کی تعداد صرف ۱۵ تھی۔گویا لڑکپن سے کافراد کی ہم جلیسی سے بھی لطف اندوز ہوتے رہے ہیں۔

ڈگری حاصل کرنے کے بعد وزارۂ تعلیم سے منسلک ہو گئے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے ڈپٹی سیکریٹری کے عہدہ جلیلہ پر بھی فائز ہوئے۔اس عہدِ ملازمت میں اقبال خان نے بلا

تفریق مذہب وملت کے سب کی حتی الامکان مدد کی اور شاید یہ اسی وجہ سے بستی بستی قریہ قریہ اور نگری نگری ڈپٹی صاحب کے نام سے مشہور ہو گئے چونکہ بلند پروازی ان کے مزاج میں داخل ہے۔اس لئے ضلع بلند شہر سے تعلق رکھنے والی شابینہ بیگم بنت محمد عمران خان کا انتخاب بطورِ شریک سفر کیا۔ بیٹا فیصل خان اور بیٹیاں فہمیدہ خان اور شیبہ خان ان دونوں کے فکر و عمل کا جیتا جاگتا روپ ہیں۔

۱۹۷۸ء میں سعودی عرب آئے۔ملازمت کا آغاز جدہ پورٹ سے کیا پھر دو سال بعد سعودی عرب ایئر لائنس کے رائل پینگر میں ایئر کرافٹ انجینئر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ برصغیر سے تعلق رکھنے والے شاید یہ پہلے انجینئر ہیں جن کو اس خاص محکمہ میں ٹیکنیکل اسامی ملی اور پھر کمپنی کی طرف سے رولس رائس انجن کی اسپیشل ٹریننگ بھی حاصل کی۔ ۱۹۸۰ء میں سعودیہ کی ملازمت شروع کی اور اسی سال ایک راہ گیر ان کی گاڑی سے ایسا زخمی ہوا کہ جانبر نہ ہو سکا۔ایک لاکھ ریال کا جرمانہ اور عدم ادائیگی پر حکومت کی قید و بند لیکن ان کی جرنل مینیجر صالح الجوفی نے سرکلر جاری کیا اور جملہ کارکنان سعودیہ سے امداد کی اپیل کی چنانچہ بہت کم مدت میں رقم فراہم ہو گئی اور اقبال خان آزاد ہو گئے۔

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے سابقہ طالبِ علم ہیں اس لئے بیوی بچوں اور بہن بھائیوں کے بعد سب سے زائد محبت اپنی اس مادرِ درس گاہ سے ہے،علیگڑھ اولڈ بوائز گروپ کا قیام اقبال خان اور مرحوم شائق رضا انصاری کی کاوشِ خاص کا نتیجہ ہے۔گو کہ شدید مخالفت رہی کیا اپنے اور کیا پرائے سب کے سب برہم اور چراغ پا نظر آئے۔گویا کیفیت یوں تھی

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوک و شنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت (فیضؔ)

لیکن خان صاحب اپنے کام میں لگن سے مگن رہے اور اب مخالفین بھی کچھ کچھ نرم ہو گئے

ان کا گروپ علیگڑھ طلباء وطالبات کے لئے وظائف کا اہتمام کرتا ہے۔ تحریری، تقریری و دیگر معلوماتی مقابلوں کا انعقاد بھی کرایا جاتا ہے۔ پہلی بار جدہ میں مقامی شعراء کی گل پوشی کا اہتمام اقبال خان کی رہبری میں ہوا، غرضیکہ کچھ کرنے کی دُھن اور کچھ کرنے کی تمنا ہے، مدت ملازمت کی یک سالہ توسیع کے بعد واپس وطن جار ہے ہیں۔ علیگڑھ سے الفتِ خاص کی بناء پر ذاتی رہائش کی بناء بھی وہی ڈالی۔ اور اندازِ تعمیر وزیبائش ان کے مزاجِ خاص کا آئینہ دار ہے۔

سیاست اور بالخصوص مسلم سیاست میں دلچسپی رکھتے ہیں اور اسی امید پر سیاسی رہبروں سے ربط وضبط بڑھاتے رہتے ہیں کہ قوم کی سیاسی عنان ایک نہ ایک دن ضرور انکے ہاتھ میں ہوگی۔

اینگلو اسلامک اسکول کا قیام کا عزم بھی ہے جس میں طلباء کو عبادت صرف عربی میں کرنے کی اجازت ہوگی اور باقی معاملات میں صرف انگریزی سکہ رائج ہوگا۔

حکومتِ سعودی عرب کے خاص ممنون ومشکور ہیں کے اربابِ حکومت کی وسیع النظری اور وسیع القلبی کی وجہ سے بے شمار مسلمین ومسلمات فیضیاب ہو رہے ہیں۔

چند یوم قبل ایک خاص تقریب میں ہندوستانی وپاکستانی احباب نے انکو نذرانۂ عقیدت پیش کیا تھا۔ علاقہ کوئی بھی ہو پہاڑی کہ ریگستانی، میدانی کہ ساحلی اقبال خان ہر علاقے میں مقبول ہیں۔ انکو کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کی لگن رہتی ہیں۔ اس لئے علامہ کا یہ شعر انکی نذر کرتا ہوں۔

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

اقبال خان ایک ایسا نگینہ ہیں جنکی تابنا کی پس پردہ اور زیرِ نقاب ہے اس لئے یہ عنوان تجویز کیا۔

ہندوستانی سفینوں کی آمد

(شائع شدہ اُردو نیوز۔جدہ)

تاریخ کے اوراق میں یہ بھی تو لکھا ہے کہ ساکنانِ بلادعرب اوراہالیانِ برصغیر کے دیرینہ تعلقات کی عمراتنی دراز ہے کہ نقش اول سرحدادراک سے بھی پرے ہے۔ ایک سلسلہ ہے باہمی محبت اور رفاقت کا۔ایک طویل داستان ہے ملی جلی تہذیب اور ثقافت کی۔اگر بلادِعرب کے صاحبانِ سیف نے اپنی برق زن شمشیر کو"المھند"یعنی ہندی تلوار کے لقب سے صیقل کیا تو زمانہ قدیم سے برصغیر کے مغربی سواحل کی قدمبوسی کرنے والے سمندر کو بحرِ عرب یا"عرب ساگر"کہا گیا۔گویادونوں ممالک ایک دوسرے کی قدروقیمت سے بخوبی واقف اوراپنی وسیع القلبی کا ثبوت دیتے ہوئے اعترافِ حقیقت بھی کرتے رہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ برصغیر کی اہم ترین زبان اردو کی لسانی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے ملک عبدالعزیز آل سعود کے دور میں کرنسی نوٹ پر اردو میں بھی قیمتِ نوٹ طبع ہوتی تھی۔

میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

آزاد ہندوستان کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہرلال نہرو سعودی عرب آئے اور سعودی حکمراں شاہ سعود بن عبدالعزیز ہندوستان تشریف لے گئے۔خیر سگالی کا یہ سلسلہ دونوں ممالک کے درمیان جاری رہا۔آنجہانی اندرا گاندھی سابق وزیرِاعظم ہند کی آمد نے مزید ایک نئے دور کا آغاز کیا،ہندوستانی بچوں کی تعلیم کے لئے حکومتِ سعودی عرب نے سابق سفیر ہند ٹی پی عبداللہ کی گزارش پر تحفتاً زمین عنایت کی اور آنجہانی اندرا گاندھی نے اس ہندوستانی اسکول کا افتتاح کیا ،باہمی محبت کی یہ داستان یادِ ماضی نہیں بلکہ ذکرِ حال ہے۔

جناب تلمیذ احمد سفیر ہند برائے سعودی عرب کی کاوش سے دو ہندوستانی سفینے خیر سگالی

مشن پر آج (۳۰ ستمبر) کو جدہ آ رہے ہیں۔ یہ دونوں جہاز ہندوستانی بحری صنعت کی ماہرانہ فنکاری کے آئینہ دار ہیں۔

آئی این ایس نیر 3000 ٹن کا وہ تربیتی بحری سفینہ ہے جس کی مزگاوں ڈاک بمبئی میں ۲۱ فروری ۱۹۸۳ء کو تکمیل ہوئی۔ فی الوقت ۷۰۰۰ کیڈٹ اس جہاز پر تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ دوسرے ممالک کے کیڈٹوں کو حکومت کی منظوری پر تربیت دی جاتی ہے۔ اس وقت تین غیر ملکی کیڈٹ تربیت حاصل کر رہے ہیں جن کا تعلق ماریشیش، گھانا اور مالدیپ سے ہے۔

''آئی این اس سجاتا'' ت ۲۹۰۰ ٹن کا یہ محافظ سفینہ ہندوستان شپ یارڈ وشاکھاپٹنم نے ۳ مارچ ۱۹۹۳ء میں مکمل کیا۔ اس محافظ سفینہ پر ۳۰ افسران ہیں اور ۲ سری لنکا کے بحری افسران تربیت بھی حاصل کر رہے ہیں۔ این این ایس کی قیادت کپٹن واز کر رہے ہیں اور آئی این ایس سجاتا کی قیادت کمانڈر سنجیو گل کر رہے ہیں۔

سفیر ہند جناب تلمیذ احمد کی قیادت میں وہ ہندوستانی سفارتی عملہ ہے جس کی ماہرانہ قیادت نے ایک بار پھر سعودی اور ہندوستانی باہمی اشتراک کی نظیر قائم کردی۔ قونصل جنرل ہند سید اکبرالدین احمد صاحب، ڈیفینس اتاشی کرنل ہال، فرسٹ سیکریٹری ذکرالرحمٰن، قونصل (عربی) محمد راشد خان اور سفارت خانے وقونصلیہ کا تمام عملہ دن رات اس خیرسگالی مشن کو کامیاب بنانے میں سرگرم عمل ہے۔ وطن سے اس خیرسگالی مشن پر آنے والے حضرات کی نذر یہ سوغات پیش کرتا ہوں:

سمندر کی لہروں سے بابِ حرم تک جو آئے
محبت کی دوری میں الفت کی کلیاں بھی لائے
محافظ جو اپنے سواحل کے شام وسحر ہیں
ہو خوشبوِ وطن کے لئے آج دامن میں آئے

اداریہ: مجلّہ اوراقِ طیبہ

(خاکِ طیبہ ٹرسٹ جدہ میں مقیم حیدرآباد کے چند مخلص اور دردمند افراد کی ایک فعال تنظیم ہے جو رفاہِ عام کی خدمات میں پوری مستعدی کے ساتھ مصروف ہے۔ والد صاحب مرحوم کو اس کے ممبران سے دوستی کے روابط کے ساتھ نیک مقاصد میں اعانت کی مماثلت بھی تھی۔ چنانچہ خاکِ طیبہ نے اس موقع پر ایک خاص مجلّہ شائع کیا ''اوراقِ طیبہ'' کے نام سے جو والد صاحب مرحوم کی ادارت ونگرانی میں نکلا تھا۔ والد صاحب مرحوم نے بخوبی اس کام کو انجام دیا اور اس کے غلاف پر ان کی تجویز کردہ عبارت بھی شائع ہوئی ''خدمتِ خلق خدمتِ خالق''، مندرجہ ذیل مضمون اسی مجلّہ کا اداریہ تھا)۔ مرتب...

مشہور کہاوت ہے کہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔ اور اس کی جیتی جاگتی مثال، خاک طیبہ ٹرسٹ جدہ کے سرگرم عمل وہ مخلص افراد ہیں جو خموشی اور انہماک سے جانبِ منزل رواں دواں ہیں اور حاجتمندوں پر ابرِ رحمت بن کر برستے ہیں۔

''خدمتِ خلق خدمتِ خالق'' کے جذبے کے تحت کام کرنے والے یہ حضرات یقیناً لائق صد ستائش ہیں۔ پسماندہ افراد کو خود فکر وخود کفیل بنانے کے لئے عزائم ان کا نصب العین، ایسے باہمت گروہ کی توصیف میں جتنا بھی کہا جائے کم ہے۔

تقریباً دس سال قبل، خاکِ طیبہ ٹرسٹ جدہ کے بانیان محمد شکور اور محمد عبد الصمد قلیل سرمائے اور محدود وسائل سے عظیم مقاصد کے متمنی ہوئے بفضلِ ربی ان کو ایسے مضبوط دستِ تعاون ملتے گئے کہ منازل کی نشاندہی خود راہیں کرتی رہیں دیکھتے اور ہر خواہش کے حقیقت روپ میں جلوہ گر ہوتی گئی

راہ خود بڑھ کے بتاتی ہے نشانِ منزل
چلنے والا بھی تو ہر گردش ایام کے ساتھ

خاکِ طیبہ ٹرسٹ نے ایک خاص مقصد کے تحت کل ہند مشاعرہ کا انعقاد کیا ہے اور ایک شایانِ شان ایک خوبصورت مجلّہ اوراقِ طیبہ کے اجراء کا بھی ارادہ کیا ہے۔ پیغامات، تصاویر، غزلیات، مضامین، کا حصول اور پھر ان سب کی ترتیب وتزئین ایک بارِ گراں ہوتا ہے لیکن بعض احباب بالخصوص محمد شکور صاحب، جمیل انصاری صاحب، عتیق الرحمٰن صاحب کی برق رفتاری کے تعاون سے یہ کام آسان ہوگیا اور اتنے مختصر عرصہ میں ایسا مجلّہ پیشِ خدمت ہے۔ خاکِ طیبہ جدہ کے چیئر مین میر احمد علی خان صاحب، صدر محمد شمیم کوثر صاحب، جرنل سیکریٹری جناب سیادت علی خان، کمپیوٹر ڈائریکٹر احمد عبدالحکیم صاحب، خازن محمد صادق علی صاحب اور جمال اللہ قادری صاحب کی ہمہ وقت حمایت سے کام آسان ہوگیا۔ میں ان تمام حضرات کا مشکور ہوں جنہوں نے خاکِ طیبہ ٹرسٹ جدہ کے عزائم کی تکمیل کے لئے اپنے دست پائے تعاون بڑھائے جس کی نشاندہی علامہ اقبالؔ نے کی ہے

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ
غالب وکار آفریں کارکُشا وکارساز

والسلام

علیم صدیقی

(مدیر اوراقِ طیبہ مجلّہ

کل ہند مشاعرہ ۹۹ جدہ)

مشاعرہ ہندوستانی تہذیب کا آئینہ دار ہے

(شائع شدہ اُردو نیوز ۱۱ر نومبر ۲۰۰۰ء۔ جدہ)

ایک بار پھر وہی ہنگامہ وہی شور وشغب اور وہی گمان ویقین کہ کیا ہوگا؟ کیسے ہوگا؟ کیا پہلے سے بھی بہتر ہوگا؟ وغیرہ وغیرہ۔ گو کہ سننے والے کان وہی ہیں لیکن کہنے والی زبان وہ نہیں ہیں جو پہلے تھیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ انداز بھی بدلے ہوئے ہیں اور طرزِ تخاطب میں بھی شوخی در شوخی کا عنصر غالب ہے۔ ابتداء جشن زرین آزادی ہند کے مشاعرے سے ہوئی اور اب اس سلسلے کی ایک اور کڑی جدہ میں ۱۶ نومبر کو ہونے والا مشاعرہ ہے۔ قونصل جرنل ہند سید اکبرالدین سے اس ضمن میں تفصیلی گفتگو ہوئی جو پیش خدمت ہے۔ بیان ان کا زبان اپنی۔

اکبرالدین صاحب نے کہا کہ مشاعرہ دراصل ہماری روایتی ہندوستانی تہذیب کا آئینہ دار ہے اور اسی محفلِ مشاعرہ کو قومی تہوار کہنا مناسب ہے کیونکہ ہندوستان کے مختلف علاقے اور تہوار اپنے اپنے انداز میں مناتے ہیں جو اس ریاست یا علاقے تک محدود اور مرکوز ہیں لیکن مشاعرہ ایک ایسا قومی تہوار ہے جو اگر شمال میں منعقد ہو تو جنوب کے شعراء اور سامعین شریکِ محفل ہوتے ہیں اور ہر فرد و بشر اپنی لیاقت و ذہانت و صلاحیت سے اس مشاعرے سے لطف اندوز ہوتا ہے اس لئے مشاعرہ ایک ایسی محفل ہے جس میں جغرافیائی نقاب تو اٹھا دی جاتی ہے لیکن روایات کا ہمیشہ خیال رکھا جاتا ہے۔

اکبرالدین صاحب نے مزید وضاحت کی کہ ۱۶ نومبر کو جدہ میں منعقد ہونے والے مشاعرے میں وہ تمام مہمان شعراء شریک ہونگے جو ریاض کے مشاعرے میں مدعو ہیں لیکن امکان یہ بھی کہ مزید مہمان شعراء کا اضافہ جدہ میں ہو جائے اور اس کی وضاحت جناب ذکرالرحمٰن مہتمم مشاعرہ کرینگے۔

مقامی ہندوستانی اور پاکستانی شعراء کو سابقہ محافل میں معزز سامعین کی حیثیت سے مدعو کیا جاتا تھا اور اس کی تمام تر ذمہ داری جناب راشد علی صدیقی کی تھی کہ وہ قونصلیہ کی جانب سے دعوت نامے پیش کریں لیکن امسال راشد صاحب کاروباری مصروفیات کی وجہ سے لکھنؤ منتقل ہو گئے ہیں اس لیے مقامی شعراء کو ایک گونہ اضطراب و بے چینی ہے، چنانچہ جناب اکبرالدین نے وضاحت کی ہے کہ جو روایت قائم کی گئی تھی اس کو ہم یاد ماضی نہیں بنائیں گے اور راشد صدیقی کی جگہ کسی دوسرے کو ذمہ داری دی جائے گی۔ غرض یہ کہ مقامی شعراء کو معزز سامعین کی حیثیت سے سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ضرور مدعو کیا جائے گا۔

روایات کی حمایت کرنے والے اکبرالدین صاحب نے کہا کہ دعوت نامہ کا اجراء بھی اسی انداز میں ہوگا۔ قونصلیہ سے رابطہ قائم کیجئے اور دعوت نامہ حاصل کیجئے۔ امسال قونصلیہ کی جانب سے جناب ڈی این شرما نائب قونصل ان تمام امور کی نگرانی کر رہے ہیں اور بہ حیثیت نگران کسی مذہبی فرقے یا علاقائی باشندگان کی وراثت نہیں ہے۔ اس پر سب کا حق ہے اور اس زبان نے سب کو نوازا ہے۔

مشاعرہ ایک روایتی تہذیبی وراثت

(شائع شدہ اُردو نیوز ۲۸ / اکتوبر ۲۰۰۰ء۔جدہ)

برسوں نہیں بلکہ صدیوں سے ہماری تہذیبی وراثت کی آئینہ دار وہ محفلِ شعر وسخن ہے جو شاعر کو بھی پابند سلاسلِ ادب رکھتی ہے اور سامع کو بھی حلقہ بگوش آدابِ محفل، نہ شاعر کو اجازت کہ غیر مہذب انداز میں اپنے کلام کو سامعین کے روبرو پیش کرے اور نہ سامع کو یہ مراعات حاصل کہ پردۂ داد و تحسین میں دامنِ ادب کو چھوڑ دے اور اسی مخصوص روایتی محفل کو مشاعرہ کہتے ہیں۔ جو ہمارے ادبی اسلاف سے ملی ہوئی ہے وہ وراثت ہے جس کے ہم وارث بھی ہیں اور محافظ بھی۔

جانے والے سے ملی ورثے میں ہم کو یہ زباں
اب محافظ اور وارث بن کے رہنا ہے یہاں

بلادِ عرب میں ایک زمانے سے اردو کی محافل شعر وسخن کا انعقاد ہو رہا ہے کیونکہ برِصغیر سے آنے والے حوصلہ مند صاحبانِ فکر ونظر نے صحراء و بیاباں کو بھی ادبی چمن زار بنادیا۔ یہاں مشاعرے بھی ہوتے ہیں خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے۔ وہ خصوصی مشاعرے ہو یا عمومی مشاعرہ۔ ان سے ہمیشہ تشنگانِ ادب سیراب ہوتے رہے بڑے پیمانے پر جتنے بھی عمومی مشاعرے ہوئے اس کے منتظمین کی اس تجارتی جنبش ابرو کو بھی شیدائی ادب غنیمت جانتے رہے کہ اسی بہانے برِصغیر کے نامور شعراء کے کلام سے فیضیاب ہونے کا موقع مل جاتا ہے اور یادوں کے خوشگوار ذخیرے میں اضافہ پہ اضافہ ہوتا رہتا ہے

بہرِ تسکین دل رکھ لی ہے غنیمت جان کر
جو بوقت ناز کچھ جنبش ترے ابرو میں تھی

پھر یہ روایت ٹوٹی اور اس کی ابتداء ایسے ہوئی کہ جشنِ زریں آزادیٔ ہند ۱۹۹۷ء کے موقع پر

سابق قونصل جنرل افضل امان اللہ اور سابق قونصل حج ذکر الرحمٰن نے جشنِ زریں کے اس جوہر میں مشاعرے کا نگینہ بھی جڑنے کا عزم کیا۔ وہ جشنِ زریں کو کسی روایتی محفل سے یادگار بنانا چاہتے تھے جو ہماری تہذیبی وراثت کی آئینہ دار ہو۔ ان کی محنت رنگ لائی اور ۲۷ نومبر ۱۹۹۷ء کی شب کو تشنگانِ ادب نے صوت ونور کی رات قرار دیا۔ وہ پہلا مشاعرہ تھا جس میں ۱۴ مہمان شعراء کو ہندوستان سے مدعو کیا گیا تھا اور تقریباً ۳ ہزار سامعین نے محض دعوت ناموں کے ذریعہ اس یادگار محفل سے بھرپور لطف اٹھایا اور پھر تو ایک سلسلہ جاری ہو گیا۔

ہماری روایات زندہ ہوئیں لیکن ذکر الرحمٰن قونصلیٹ جدہ سے سفارت خانہ ہند ریاض منتقل ہو گئے اور سید اکبر الدین قونصل جنرل ہند کی حیثیت سے تشریف لائے۔ اس آمد ورفت کے باوجود روایتی نقوش مدھم نہیں ہوئے۔ سفیرِ ہند جناب تلمیذ احمد نے روایات کے فروغ کی حمایت کی اور وہ عظیم الشان مشاعرہ جو گزشتہ تین سال سے صرف جدہ میں منعقد ہو رہا تھا اس کو امسال ریاض میں بھی منعقد کرنے کی منظوری دے دی۔ گویا ذکر الرحمٰن صاحب کا ادبی جوشِ جنوں رنگ لایا اور باہمی تعاون سے کیفیت ونتائج ظاہر ہوئے۔

کچھ جوش جنوں میرا کچھ طرزِ ادا تیری
منزل کی ہر ایک دوری قدموں میں سمٹ آئی

ذکر الرحمٰن صاحب سے اس ضمن میں تفصیلی بات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ ۹ نومبر ۲۰۰۰ء کو بسلسلہ جشنِ آزادی ہند پہلے عظیم الشان مشاعرے کا انعقاد ریاض میں ہوگا مشاعرہ انڈین انٹرنیشنل اسکول (ریاض) کا وسیع پُرشکوہ آڈیٹوریم میں ہوگا جس میں تقریباً ۳ ہزار خواتین وحضرات سامعین تشریف فرما ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے مزید وضاحت کی کہ ریاض میں منعقد ہونے والا یہ پہلا عظیم الشان مشاعرہ ہے اس لئے شائقینِ ادب سے گذارش ہے کہ دعوت نامے کے حصول کی درخواست

جلد از جلد سفارت خانہ ہند میں بذریعہ فیکس بھجوادیں۔ریاض سفارت خانہ کا فیکس نمبر ۴۸۸۴۷۵۰ ہےاورانکا کہنا ہے کہ تعجیل احسن ہے تاخیر سے کیونکہ نشست کی تعداد خواہ کتنی ہی زائد کیوں نہ ہولیکن اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور جب ادبی محفل کے شائقین حد ادب میں رہتے ہیں تو منتظمین کو بھی حدود کا تعین کرنا لازمی ہے۔

ذکرالرحمٰن صاحب نے بتایا کہ ۹ نومبر کو ریاض میں مشاعرہ ہے اور ۱۶ کو جدہ میں۔جس میں وہ تمام مہمان شعراءشریک ہونگے جو ریاض کے مشاعرے میں مدعو ہیں۔اس سوال کے جواب میں کہ مہمان شعراء کا تعلق کسی مخصوص علاقے یا خطے سے ہے؟ جناب ذکرالرحمٰن نے وضاحت کی کہ شاعرات وشعرائے کرام کوسفارت خانہ ہند مدعو کررہا ہے۔اس لئے ہندوستانی شعراء وشاعرات کا انتخاب ہوا ہے صوبہ جاتی،حد بندی ادبی شان کے شایانِ شان نہیں ہے۔مہمان شعراء کے نام کا اعلان کرتے ہوئے رحمٰن صاحب نہایت پراعتماد تھے گویا ان کو اطمینان ہے کہ ریاض اور جدہ کی اس ادبی معرکے کو سر کرنے کے لئے بہترین انتخاب کیا گیا ہے۔متوقع مہمان شعرائے کرام میں حسبِ ذیل شامل ہیں:۔جناب گلزار دہلوی،جناب قیصر الجعفری،جناب افتخار امام،جناب مضطرمجاز،جناب راحت اندوری،جناب ساغر اعظمی،جناب نواز دیوبندی،جناب ساغر خیامی،جناب منصور عثمانی،محترمہ انجم رہبر،جناب رؤف خیر،محترمہ ڈاکٹرنسیم نکہت،جناب بازق بہاری،جناب خالدزاہداور جناب حسین جے پوری۔

ذکرالرحمٰن صاحب فون پر مشاعرے کی تفصیلات بتارہے تھے اور میرے ذہن میں غالب کا یہ شعر گونج رہا تھا کہ صحراء میں بھی پھول کھلانے والے گل کھلاتے ہی رہتے ہیں

دیکھو تو دلفریبی اندازِ نقشِ پا
موج خرام بھی کیا گل تر گئی

اردو نیوز کے خطوط

والد صاحب مرحوم کا تعلق اردو صحافت سے قدیم بھی ہے اور گھریلو بھی۔ چنانچہ والد صاحب کے حقیقی خالو جناب انیس احمد عباسی مرحوم اردو صحافت کے مانے ہوئے صحافی تھے جن کے زورِ قلم نے تحریکِ آزادیء ہند میں اپنا جلوہ دکھایا۔ ان کا ہفتہ وار اخبار ''حقیقت'' والد صاحب مرحوم کے آبائی مکان مصطفیٰ منزل سے شائع ہوتا تھا۔

اس کے علاوہ لکھنؤ کے مشہور صحافی جناب حسین امین صاحب کے بھی والد صاحب مرحوم سے پرانے تعلقات تھے۔ اور روز نامہ ''دنیا'' میں ان کے مقالات نے قارئین کی پذیرائی حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

اس کے بعد بمبئی کے دورانِ قیام میں والد صاحب کا ربط واتصال اُس وقت کے فلمی دنیا کے مشہور صحافی جناب حسن کمال صاحب سے ہوئے۔

ابتداء میں سعودی عرب میں انگریزی اور عربی صحافت کو بہت اہمیت حاصل تھی آنے والے مرحلے میں اردو نیوز کی اشاعت ہوئی جس نے سعودی عرب میں مقیم لاکھوں باشندگانِ برصغیر کو اپنے خیالات اپنی مادری زبان میں تحریر کرنے کے مواقع فراہم کیئے۔

والد صاحب مرحوم وقتاً فوقتاً اردو نیوز کے کالم ''آپ کے خطوط'' میں بہت اہتمام سے لکھتے تھے اور ان کی ادبی افادیت اور علمی گہرائی سے انکار نہیں۔ چنانچہ ان خطوط کو قارئین کرام کے سامنے پیش کیئے جارہے ہیں۔ مناسب حواشی سے مبہم الفاظ کی مختصر تشریح بھی کی گئی ہے۔

مُنھ کی بدبو کا روحانی علاج

شائع شدہ اردو نیوز

''ایک متجسسِ علاج کا اور دوسرا مدعی معالجہ کا، سائل کو منہ کی بدبو دور کرنے کا معالجہ اور تدبیر کی جستجو اور محترمہ میمونہ فاطمہؒ نے بظاہر مختصر لیکن درحقیقت ایک طویل اور استمراری عمل کی ترغیب دے دی۔ اسی ضمن میں کچھ عرض کرنا ہے۔

بچپن سے یہی سنا کہ جھوٹ بولو گے تو مونھ سے بدبو آئے گی بظاہر ایک مختصر سا جملہ اور چھوٹی سی تنبیہ لیکن حقیقتاً اپنے اندر ایک دریائے معنویت سموئے ہوئے۔ یعنی مہمل گفتگو اور بے معنی طرزِ کلام سے گریز کرو ورنہ دوسرے تمہارے اعمال سے بخود آگاہ ہو جائیں گے۔

اگر آپ خواہاں ہیں کہ آپ کے منہ کی 'بدبو' 'خوشبو' میں بدل جائے تو اپنی زبان مبارک سے زیادہ ان الفاظ کی ادائیگی کریں جو دل شکن (۱) نہیں بلکہ دلپذیر (۲) ہوں۔ دل آزار (۳) نہیں بلکہ دلدار (۴) ہوں۔ اہتمام کیجئے کہ ذکر اللہ اور ذکرِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں زبان زیادہ سے زیادہ مصروف رہے پھر

دیداز پردۂ غیب چہ آید بہ ظہور (۵)

اگر آپ شاعر، ادیب یا قلمکار ہیں تو علامہ اقبالؒ کے اس فرمان کو اپنی حیاتِ دنیوی کا لائحہ عمل بنالیں

---

(۱) دل شکن: دل توڑنے والی چیز

(۲) دل پذیر: دل لبھانے والی چیز

(۳) دل آزار: دل دکھانے والی چیز

(۴) دلدار: دل والی چیز

(۵) دیداز پردۂ غیب چہ آید بہ ظہور: ترجمہ:۔ دیکھو کیا چیز پردۂ غیب سے ظہور میں آتی ہے۔

پاک رکھ اپنی زباں تلمیذِ رحمانی ہے تو

ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو

اگر محض ترکاری کھانے سے بدبو نہ آتی تو پھر ہندوستان کی ایک سیاسی جماعت کے افراد کے گرد پیش نہایت مہک دار ہوتا کیونکہ ان کی اکثریت ترکاری کھاتی ہے۔ جبکہ ایک خلقت اس حقیقت سے آشنا ہے کہ ان کی ہیئت تو ہیئت ان کے بیانات میں اتنا تعفن ہوتا ہے کہ ناک تو ناک کان بھی بند کرنا پڑتا ہے اس لئے ذکر اللہ اور ذکر رسول اللہ ﷺ میں اپنی قوتِ گویائی میں صرف کریں انشاءاللہ خاطر خواہ افاقہ ہوگا۔

نام کے اثرات (شائع شدہ اُردو نیوز (جدہ)

آج کی تازہ خبر کہ پاکستانی وزیر اعظم جناب نواز شریف صاحب نے صوبہء شمس یعنی شمالی ،مغربی، سرحدی صوبے کا نیا نام ''افغانہ'' تجویز کیا ہے۔

نام کی برکت اور اثرات تو ہمیشہ سے ظاہر ہوتے رہے ہیں، اسی لئے اچھا نام رکھنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ ویسے میری رائے میں اس صوبہء شمس کو افغانہ کی بجائے اگر شریفانہ نام دیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اس سے شریفانہ اثرات کا ظہور بھی ہوگا اور پھر نواز شریف کے عہدِ حکومت میں یہ تبدیلی عمل میں آئے گی تو لفظ 'شریفانہ' ہمیشہ تاریخ کے اوراق میں ''شریف عہد'' کی نشاندہی کرتا رہے گا۔

ویسے علامہ اقبالؒ تو الفاظ کے ان گورکھ دھندوں کو تسلیم نہیں کرتے تھے

الفاظ کے پیچوں میں الجھتا نہیں دانا

غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

لیکن اب کیا کیا جائے زمانہ کی ہوا ایسی ہی چل رہی ہے، اور وقت کا دھارا یونہی بہہ رہا ہے اس لئے

میری رائے میں شریفانہ نام سے ایک پنتھ دوکاج کی مثل صادق ہوتی نظر آئے گی۔

نازہے طاقت گفتار پہ (شائع شدہ اُردو نیوز (جدہ)

اردو نیوز (۲۸ اگست) میں جل کر ایک گروہ نے بہت کچھ کہنے کی کوشش کی ہے۔بات اگر ''ہماری اردو'' کی نہ ہوتی تو یہ کہہ کر خاموش ہوجاتا کہ

تومشقِ ناز کر خونِ دوعالم میری گردن پر

اب آیئے کچھ موضوعِ سخن کی توجہ ہوجائے۔وہ قونصل جج کی تعریف میں نیوز نہیں تھی بلکہ قونصل جنرل کی ایماء سے باقاعدہ انٹرویولیا گیا تھارہی بات شایانِ شان محفلوں کی ابتداء تو اس پر چراغ پا ہونے کی کیا ضرورت؟ وہ تمام حضرات جو اردو کی عظمت اور اس کی سربلندی کے علمبردار ہیں ان کو اس اعترافِ حقیقت میں کیا قباحت کہ مشاعرہ جشنِ آزادی ایسی محفل تھی جس میں ۱۴ مہمان شعراء ہندوستان سے تشریف لائے،محفل کے وقار کو بڑھایا اور تقریباً ڈھائی ہزار سامعین کو بلا معاوضہ شعری،ادبی،وذہنی تسکین کے سامان فراہم کئے۔اردو کے وجود کی دلیل تو یہی ہے کہ جہاں چند شعراء جمع ہونگے وہاں مشاعرہ چھوٹے بڑے پیمانے پر مشاعرہ ہونا لازمی ہے۔مشاعرہ جشن زریں کی انعقاد سے پہلے ''ادبی خدمت گار'' مشاعروں میں ٹکٹ بھی لگاتے ادھرادھر سے خاصی رقم اکٹھا کرتے اور پھر کہتے پھرتے کہ نقصان ہوگیا۔اب جب قونصلیٹ نے بلا معاوضہ دعوت ناموں کے ذریعہ مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا تو ایسے خدمت گاروں کے کاروبار کو خوب لگی اور

جو بیچتے تھے ٹکٹِ مشاعرہ
وہ دکان اپنی بڑھا گئے

اور یہی حضرات وار کرنے سے نہیں چُوکتے۔کبھی اُدھر سے لیکن سامنے نہیں آتے۔مزید وضاحت کردوں کہ ایئر انڈیا دس شعراء کا ''صرف ٹکٹ دیتی ہے اس سے زائد شعراء کے آمدورفت،قیام

وطعام، ونذرانہ وتحائف کے دیگر مصارف قونصلیٹ ادا کرتی ہیں۔
دو مخصوص ''ٹکٹ زدہ'' مشاعروں کی توصیف کرتے ہوئے قونصلیٹ کے عدم تعاون کا بھی ذکر ہے جبکہ اس وقت کے قونصل جنرل ان کی اس ''تاریخی یادگار محفل'' میں شریک ہوئے تھے۔ اگر آپ کی کوتاہ دستی سے جام آپ تک نہ پہونچ سکا تو ساقی کو کیوں خطاوار وسزاوار ٹھہراتے ہیں۔
زورِ بیان میں دامن ادب بھی ہاتھ سے چھوٹا اور لکھ دیا کہ قونصلیٹ کے نام پر کوئی بھی شاعر مشاعرہ پڑھنے آجائیگا۔ مشاعرہ پڑھنے کی ترکیب سے کچھ کچھ نشاندہی ہوتی ہے بقولِ شاعر

نشان ملتا نہیں شوریدہ سر کا دشتِ الفت میں
پتہ دیتی ہے کچھ کچھ دھجیاں لیکن گریبان کی

آپ شعرائے کرام کو اتنا چھچھورا اور بکاؤں کیوں سمجھتے ہیں کہ ادھر اشارہ ہوا اور ادھر گنگناتے ہوئے قدم بڑھادیئے۔ جن شعراء وشاعرات سے محفل کی زینت بڑھتی ہے ان سے با ادب گذارش کی جاتی ہے اور وہ ایک بار نہیں بلکہ بالاستمرار تب کہیں یہ چاند ستارے بامِ ادب سے فرش مشاعرہ پر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ وہ اس پر بھی معترض کہ ایک صاحب اپنے گھر پر قیام وطعام کا انتظام کر دیتے ہیں چہ خوب میزبان کی تضحیک کرتے ہوئے نہ تو نظر جھکی اور نہ قلم رہی بات مصارفِ طعام کی تو قونصلیٹ اس کو بھی ادا کرتی ہے۔
اسکول آڈیٹوریم کے ضمن میں ذکر الرحمٰن صاحب نے بتایا کہ آڈیٹوریم کا کرایہ اور دیگر اخراجات مثلاً پانی وبجلی کا خرچہ، کرسیوں کا کرایہ حتی کہ بعداز مشاعرہ صفائی وستھرائی کے لئے بھی رقم ادا کی جاتی ہے۔

۱۲ ستمبر کو قونصلیٹ میں مہمان شعراء کے ساتھ دعوتِ عشائیہ کا اہتمام کیا گیا اور اس محفل خاص کی تمام تر ذمہ داری ''انڈین حج ویلفیر فورم'' کی ہے اور اس سے جو بچت ہوگی وہ حجاج کی امداد

میں خرچ کی جائے گی۔ رواروی میں ہندوستانی حجاج کو درپیش مسائل کا ذکر تو ہے لیکن بہتر تو یہ ہوتا کہ حتمی نشاندہی کرتے تاکہ تدارک کیا جاسکتا۔ اب ایسے تیر نیم کش سے کیا فائدہ کہ مستقل خلش رہے۔

شکریہ اس اعتراف کا کہ بعض مشاعروں میں شریک تو ہوتا ہوں لیکن ''سامعین'' کے حیثیت سے۔ فردِ واحد کی ایسی شرکت کا علامہؒ نے بھی ذکر کیا ہے۔

انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو
شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

خلافِ شرع (شائع شدہ اُردو نیوز (جدہ)

عبدالرب بوھیرہ کا راستہ (اردو نیوز ۲۴ جون) خوب ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ صرف ٹائی نہ لگانے کی سرزنش میں ملازمت سے برخواست کیا جارہا ہے جبکہ اس فرمانِ نادری کی دوسری شق کہ کوٹ کا استعمال لازمی ہے۔ اس سے غیر مسلمہ خواتین کو مستثنیٰ کردیا گیا۔ ایسا کوئی تحریری حکمنامہ تو جاری نہیں کیا گیا ہے۔ براہِ کرم ایک بار پھر تصدیق کریں اور اس کے بعد کچھ لکھیں تو زائد مناسب ہوگا۔

رہی بات ٹائی کے استعمال کی تو حضرت ہر ٹائی لگانے والا عیسائی نہیں بن جاتا اور ہر پتلون پہننے والا مسیحی مسلک کا حامل نہیں ہوتا۔ اول تو ہمارے عقیدے کی رو سے ابن مریم کو صلیب پر چڑھایا ہی نہیں گیا دوئم ٹائی میں صلیب کی مماثلت کس حساب سے؟ اگر یہ کہیں کہ نیچے کا حصہ طویل اور جانب کے دونوں حصے چھوٹے تو ایک صلیب کی شکل بن جاتی ہے۔ کیا خوب ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک صاحب نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے تو ایک صاحب نے منع کیا کہ ایسا مت کرو کیونکہ اس انداز میں صلیب کی مماثلت ہے اب ایسی احتیاط سے کیا فائدہ کہ ہاتھ پاؤں ہلانے پر

بھی پابندی، ویسے جہاں تک مجھے علم ہے کہ عرب شہسوار جب ساتویں صدی میں اندلس پہونچے تو اپنے عربی لباس، عمامہ سے مزین تھے۔ صحرائے عرب میں وہ اس کو گرمی سے بچنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ لیکن وہاں کی آب و ہوا سرد تھی اس لئے ان شہسواروں نے سر کے عمامہ کو اتار کر گلے میں ڈال لیا ان کا یہ انداز محکومین کو پسند آیا اور انہوں نے بھی اس کو اختیار کیا جو رفتہ رفتہ فیشن کی وجہ سے ٹائی بن گیا۔ آپ چار پانچ سو برس پہلے کی مسیحی تصاویر دیکھیں تو ٹائی نہیں ملتی۔ بہر حال اس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے صرف گذارش ہے کہ ایسے نہ بن جائے کہ لوگ کہیں

خلافِ شرع شیخ تھوکتا بھی نہیں

طرزِ کہن پہ اڑنا (شائع شدہ اُردو نیوز (جدہ)

''ٹائی کی حقیقت (اردو نیوز ۲ جولائی) در حقیقت معترضین کی گل افشانی گفتار (۱) نہیں ہے بلکہ وہ اظہار جھنجھلاہٹ ہے کہ پڑھتے ہی استاد کا شعر یاد آ گیا

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا

جنابِ من! یہ اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ لکھنؤ کی تحقیق ہے۔ اگر آپ کو اس تحقیق سے انکار ہے تو آٹھویں صدی سے پہلے کی کوئی ایسی تصویر پیش کر دیں جس میں ٹائی کا استعمال واضح ہو۔ (۲) فیشن کا سہارا لے کر ہمیشہ نئی نئی طرز و تشکیل اور ملبوسات منظرِ عام پر آتے رہے ہیں۔ شاید یہ معلومات بھی ان کے لئے نئی ہو کہ اہل عرب جس ثوب (عبا) کو استعمال کرتے تھے اسمیں کالر نہیں

---

(۱) گل افشانی گفتار: باتوں کو اس انداز میں کرنا معلوم ہو کہ پھول بکھر رہے ہوں۔

(۲) والد صاحب مرحوم کا کہنا ہے آٹھویں صدی عیسوی قبل مغربی حضرات کی تصاویر میں ٹائی کا وجود نہ ہونا ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے۔ ٹائی کا استعمال انیسویں صدی کے اواخر میں ملتا ہے۔

ہوتا تھا۔روایت ہے کہ عباسی خلیفہ کے برمکی وزیر(۱) کی گردن پر سیاہ داغ تھے اسکو چھپانے کیلئے اس نے کالر کی وضع ثوب میں ایجاد کی اور آج سب سے زیادہ جو ثوب مروج ہے وہ یہی کالر والی ہے۔فیشن نے دونوں رنگ اپنائے یعنی سنگل کالر بھی اور ٹرن کالر بھی کیا کہتے ہیں؟

ایک بات کی وضاحت لازمی ہے کہ دنیا کے ہر مذہب میں علماء اور اہلِ دین کا لباس ہمیشہ عوام الناس کے لباس سے مختلف رہا ہے۔آپ علماء کے لباس کو عوام الناس کا لباس بنا کر در حقیقت ان کے لباس کا امتیاز اور تفاخر ختم کرنا چاہتے ہیں۔لکھنے والے کیا اس بات کا جواب دے سکیں گے کہ شیروانی (۲)،کوٹ، پتلون، قمیص (دور حاضرہ کی) اور اسی قسم کے دوسرے تن پوشی اور زیبائش ملبوسات کیا اس دور میں مروج تھے؟جس کی نشاندہی موصوفین کررہے ہیں۔

یہ تو وہی بات ہوئی گُڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز (۳)

اختصار سے کام لیتے ہوئے علامہ (۴) کا ایک شعر پیشِ خدمت ہے

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

---

(۱) عباسی خلیفہ سے مراد ہارون رشید ہے۔جو کہ علم دوست اور منصف بادشاہ تھے لیکن برمکی خاندان پر مظالم کی وجہ سے بہت غم زدہ ہوئے چنانچہ بیت اللہ پیادہ سفر کیا۔برمکی خاندان دراصل بلادِ فارس سے تعلق رکھتا تھا اور عباسی دورِ حکومت میں مشرف باسلام ہوا۔اس خاندان کے چشم چراغ یحیٰ البرمکی تھے۔

(۲) والد صاحب نے شیروانی کا شمار بھی ان ملبوسات میں کیا ہے کیونکہ شیروانی بھی قرونِ اولی کی ملبوسات میں نہیں تھی۔تو اس کے خلاف شرع یا خلافِ سنت ہونے کی یہ وجہ نہیں ہوسکتی کہ یہ جدید لباس ہے۔

(۳) ''گُڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز''،یعنی خطرناک شئے سے اعتراض نہیں اور کم خطرے والی چیز سے بُعد

(۴) یعنی علامہ محمد اقبالؒ

دونوں سے بے نیاز (شائع شدہ اُردو نیوز (جدہ)

''مرحومین خمارؔ بارہ بنکوی اور حیات اللہ انصاری کا تعزیتی جلسہ جب ہوگیا تب آپ نے روداد شائع کی۔ شاید سوگروان نے اس کو مناسب نہ سمجھا ہوگا کہ تعزیتی جلسے کی تاریخ کا اعلان وقت سے پہلے کیا جائے ہوسکتا ہے کہ ان کا یہ گمان رہا ہو کہ دورِ حاضر کی ایسی قد آور شخصیت کے تعزیتی جلسے کی خبر پڑھ کر سوگواران کا ہجوم جلسہ گاہ کی کشادگی کو تنگی میں بدل دے گا۔

لیکن صد افسوس کہ اس مجلس میں صرف وہی غمزدہ دکھائی دیئے جن کو اس شب میں کوئی اور غم نہ تھا اور ان کی نظریں بھی کرتی رہیں ان ''مشاہیر'' کو جو اپنے کو اردو کا کہتے ہیں اور اردو ہی جن کی پہچان ہے میں نے منتظمینِ مجلس سے براہِ راست سوال بھی کیا کہ کیا ان مشاہیر کو مدعو نہیں کیا گیا؟ تو معلوم ہوا کہ فرداً فرداً سب کو اطلاع کی گئی تھی اور ''شخصی گذارش'' بھی۔ جبکہ شخصی گذارش کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ حیاتؔ اور خمارؔ کا غم فردِ واحد کا غم نہیں ہے بلکہ یہ ایک عہد کا سانحہ ہے۔ چنانچہ بعض مشاہیر کی عدمِ شرکت سے کسی استاذ (۱) کے شاعرانہ خیال نے حقیقت کا روپ اختیار کرلیا۔

بس اتنی سی حقیقت فریبِ خوابِ ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ بن جائے

(۱) استاذ یعنی جگر مراد آبادی

شعر وادب کا مقام (۱)

’’مکرمی! کسی ڈوبنے والے کی حمایت میں محمد اشرف کا مراسلہ (۴ ستمبر) بہت خوب ہے۔ جذبات کی ایسی صحیح عکاسی ہوئی اور تحریر سے وہ نقش ابھرائے کہ بے ساختہ زبان پر کسی استاذ کا یہ شعر آ گیا

لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں حضرت
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا

وہ خود تو بدگماں ہیں شعر وادب سے لیکن قارئین کو متاثر کرنے کے لئے جس بیساکھی کا سہارا لے رہے ہیں اس کو تمام اہلِ ادب شعر کہتے ہیں۔ موصوف کا یہ بھی فتوی کہ شاعری ’’کارِ بیگاراں‘‘ (۲) تو حضور! حمد (۳)، نعت (۴)، منقبت (۵)، اور قصیدہ (۶) وغیرہ کا ان کی نظر میں کیا احترام اور مقام۔

---

(۱) (شائع شدہ اردو نیوز کا پی سے نقل کیا گیا اور اردو نیوز کا شمارہ دستیاب نہ ہوسکا لہذا عنوان مرتب کی طرف سے ہے) (۲) کارِ بیگاراں: ایسی محنت ومزدوری جس میں معاوضہ نہ ملے۔

(۳) حمد: شاعری کی وہ وہ صنف جس میں شاعر خدائے ذوالجلال کی عظمت اور بزرگی بیان کرتا ہے اس میں شکر بھی شامل ہوتا ہے اور اس میں خضوع وانابت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

(۴) نعت: شاعری کی وہ صنف حس میں شاعر نبیء اکرم ﷺ کے بلند مقام اور بے تحاشا احسانات جو ایک امتی پر ہیں ان کا ذکر عاشقانہ اور والہانہ انداز میں کرتا ہے۔

(۵) منقبت: شاعری کی وہ صنف جس میں شاعر کسی صاحبِ مقام یا صاحبِ علم یا کسی اللہ والے کی تعریف اشعار کے ذریعہ پیش کرتا ہے۔ (۶) قصیدہ: شاعری کی وہ صنف جو کسی خاص مقصد یا موقع پر شاعر کی طرف سے ظاہر ہوتی ہے۔ مقصد دعوتی یا سیاسی یا اجتماعی (سماجی) بھی ہوسکتا ہے اور موقع خوشی یا غم، جنگ یا سلامتی، اپنائیت یا اجنبی پن ہوسکتا ہے۔

بات ذرا سی تھی اور انہوں نے بتنگڑ یوں بنا دیا خواہ مخواہ بگڑنا شروع کر دیا۔

خدا جانے وہ کیا سمجھے جو بگڑے اس قدر مجھ پر
کہا تھا میں اتنا ہی مجھے کچھ عرض کرنا ہے

وہ پروازِ تخیل جو شعر کے روپ میں ڈھل کر ہماری تسکینِ سماعت بنتی ہے اسی کو موصوف نے لہو ولعب قرار دیا۔ مولانا حسرت موہانی (ا) نے ایسے ہی باذوق کی نشاندہی کی ہے

رعنائی خیال کو ٹھہرادیا گناہ
واعظ بھی کس قدر ہے مذاقِ سخن سے دور

(ا) حسرت موہانی اردو کے صفِ اول کے شعراء میں تھے۔ ان کا تعلق قصبہ موہان سے تھا۔ تحریکِ آزادی میں انکے اقدامات ناقابلِ فراموش ہیں۔ والد صاحب مرحوم کے استاذ اور برادرِ نسبتی جناب غلام فرقت کاکوروی کے قریبی رفقاء میں تھے۔

خطوطِ علیم احمد صدیقی

خطوط کا تاریخی ثبوت:

خط کا تحریر کرنا تاریخ کی مستند کتابوں میں عہدِ قدیم سے پایا جاتا ہے۔مزید اس کے قرآن شریف میں ہے نبیءِ خدا حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہءِ سبا (بلقیس) کو بھی خط تحریر فرمایا تھا۔اس مبارک خط کا (جس کا مقصد دعوتی تھا) مغزی و مفہوم قرآن شریف میں آیا ہے

خطوط کا مقام:

خطوط نے ہر ادب اور ہر زمانہ میں ایک خاص مقام رکھا ہے جس کی وجہ صاحب خط کی سادگی اور برجستگی ہوتی ہے۔صاحبِ خط بسا اوقات اس سادگی اور اخلاص میں ایسے ایسے گوہر نایاب عیاں کرتا ہے کہ آنے والی نسلوں کے لئے مشعلِ راہ فراہم ہو جاتی ہیں۔

خطوط کا مقصد:

کبھی خطوط کا تحریر کرنا کسی خاص مقصد اور مشن کو مدِ نظر رکھ کر ہوتا ہے۔جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کے متعدد خطوط جو فارس اور روم اور دیگر ممالک کے حکمراں کو بھیجے گئے تھے۔ان خطوط کا مقصد خالص دعوتی تھا۔اور بسا اوقات خطوط کا مقصد ذاتی اور امورِ عامہ سے آگاہ کرانا ہوتا ہے۔

والد صاحب مرحوم کے خطوط:

ہمارے والد صاحب کے خطوط دونوں قسم کے ہوتے تھے،بعض دفعہ صرف حالات سے آگاہ کراتے اور خیریت معلوم کرتے اور بسا اوقات دعوتی،اور ادبی نکات کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا،جو

خطوط ذاتی امور پر مشتمل تھے ان سے شاید قارئین کو اتنا استفادہ نہ ہوگا چنانچہ یہ محسوس کیا گیا کہ خطوط (جن کی مقدار کافی ہے) کا بعینہ نقل کر دینا حکمتِ عملی کے سراسر خلاف ہوگا۔ اس وجہ سے خطوط کا بغور مطالعہ کیا گیا اور ان کو مختلف عناوین کے ذیل میں پیش کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ قارئین کے لئے یہ مفید اور دلچسپ انتخاب ہوگا۔

بچوں پر شکر کرنا:

"شاید تم کو احساس ہو کہ شکرِ ربی کرتے وقت میں بیوی کے ساتھ بچوں کا ذکر کرتا ہوں اور یہ اس حدیث نبوی کے تابع ہے جس کا متن اور مفہوم ہے کہ جب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے سیدہ خدیجہ الکبری رضی اللہ عنہا کے بارے میں کچھ تیز رویہ اور انداز اختیار کیا تو سرکارِ دوعالم ﷺ نے ام المومنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت اور اہمیت بتائی اور اس میں یہ بھی ذکر فرمایا کہ اللہ نے اس کے ذریعہ مجھے اولاد عطا فرمائی"۔

یوں تو اللہ رب العزت کی ہر نعمت بڑی اور اہم ہے لیکن ان تمام بڑی نعمتوں میں بہت بڑی نعمت بیوی اور اولاد ہے۔ اسی لئے ہمارے مشائخ نے فرمایا ہے کہ قرآن کریم یہ دعا بہت جامع ہے

"ربنا ھب لنا من ازواجنا وذریاتنا قرۃ اعین واجعلنا للمتقین اماماً"

بنام محمد عبداللہ صدیقی

۲۱ مئی ۲۰۰۰ء جدہ

صبر کرنے والوں کا ذکر سورہ العصر میں:

''سورہ العصر میں اللہ تعالی نے جن منتخب افراد کا ذکر فرمایا ہے وہ کون ہیں؟

۱) صاحبِ ایمان　　　　　　　　　۲) اعمالِ صالحہ کو کرنے والے

۳) حق کی بات تواتر اور تکرار سے کرنے والے　　　　　۴) اور ان کو بھی صبر کرنا پڑے گا

گویا نفسِ انسانی اور صبر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بس اللہ رب العزت رحم فرمائے اور ربنا و لا تحملنا ما لا طاقة لنا به

ہماری طاقت، استطاعت سے زائد بوجھ نہ ڈالے صرف اللہ کا فضل و کرم ہے جو توفیق عطا ہوتی ہے اور جو توفیق عطا کرتا ہے۔ انشاء اللہ اپنے فضل سے وہ کامیابی و کامرانی بھی عطا کرے گا۔

بنام محمد عبداللہ صدیقی

۲۱ مئی ۲۰۰۰ء جدہ

سورہ یسین میں داعی کی دعا:

''سورہ یسین میں جس مردِ صالح کا ذکر ہے ''وجاء من اقصى المدينة رجل يسعى'' اس کے بعد اس کو شہید کر دیا گیا۔ یہ وہ شخص تھا جو رسول کی حمایت میں شہید ہوا لیکن اس نے اپنے عمل کو باعثِ مغفرت نہیں بتایا بلکہ کہا ''بما غفرلی ربی وجعلنی من المكرمين'' یعنی صرف رب کی رحمت و مغفرت سے درجاتِ عالیہ عطا ہوتے ہیں۔

بنام مرتب کتاب

۲۱ جنوری ۲۰۰۱ء جدہ

اصحاب السبت پر تنبیہ:

"سنیچر کو خط لکھنے کو اس لئے کہا تھا کہ اس دن تمہاری چھٹی ہوتی ہے اور تم نے یوم السبت یعنی اصحاب السبت (۱) کا خیال کیوں کیا؟ کیا تم سوچ سکتے ہو کہ میں کسی بھی مسلم بھائی بہن کو ایسی مماثلت دونگا جس کی صریحاً ممانعت آئی ہے اور وہ بھی اپنے پیارے بیٹے کو۔ تم دوشنبہ یا جمعہ کو خط لکھا کرو اس طرح تمہارا دل بھی مطمئن رہے گا اور ہمارا بھی کام بن جائے گا (۲)

بنام مرتب کتاب

(۲۳ اگست ۲۰۰۱ء جدہ)

---

(۱) اصحاب السبت کا ذکر قرآن شریف میں آیا ہے کہ نبی خدا حضرت موسی علیہ السلام کے حکم کی نافرمانی کی سزا انہیں ملی تھی۔ اللہ تعالی کا پیغام حضرت موسی علیہ السلام کے پاس آیا کہ آپ اپنی قوم کو منع کردیں کہ سنیچر (جس کو عربی زبان میں السبت کہتے ہیں) شکار نہ کریں۔ قوم کے بعض افراد نے بات کو مانا لیکن بعض نے حیلہ اور چالاکی سے کام کیا کہ سنیچر کے دن جال بچھاتے اور اتوار کے دن سنیچر کی مچھلی کا لطف اٹھاتے۔ اللہ تعالی نے اس گروہ کے افراد کو سختی سے عقوبت دی۔ (۲) والد صاحب مرحوم نے اس خط میں تنبیہ کردی کہ اس قسم کی ادبی لطائف اور چٹکلے بازی مناسب نہیں ہے کیونکہ بعض دفعہ انسان اس میں شرعی حدود سے تجاوز کر جاتا ہے۔

تقدیراوردعا:

''علامہ اقبالؒ کاایک شعر ہے

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں
ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

یہ شعراس حدیثِ نبوی کے تابع ہے "لا یرد القدر الا الدعا"

یہاں سرکارِ دوعالمﷺ نے ہمت، محنت، علم، فلسفہ، مال ودولت، اور دوسرے اسباب کا ذکرنہیں فرمایا بلکہ صرف اتناہی فرمایا کہ تقدیر کوصرف دعا بدل سکتی ہے۔ اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ جس نے دعا کی توفیق عطا کی اور یہ یقین عطا کر دیا کہ وہی دعا کا سننے والا ہے اور انشاءاللہ دعا ضرور پوری ہوگی۔ تاخیر وتعجیل میں بھی اس کی حکمت ہے اوراس کی حکمت ہمیشہ اپنے بندوں کے حق میں ہوتی ہے کیونکہ اپنے بارے میں خود فرمایا

"وما انا بظلام للعبید"

بنام محمد عبداللہ صدیقی

۲۱ مئی ۲۰۰۰ء جدہ

ایمان کے درجے:

''گذشتہ سفر میں تم کو بتایا تھا کہ خاندان کے بعض افراد غیر مسلمین کے ساتھ چلے جاتے ہیں اور ہماری طرف سے کوئی احتجاج نہیں ہوتا، جبکہ دل میں بُرا کہنا سب سے کم اور زبان کا اس سے زائد۔ ظاہر ہے اتنی قدرت نہیں کہ ہاتھ سے روک سکیں۔'' (۱)

بنام مرتب کتاب

۲۱ جنوری ۲۰۰۱ء جدہ

(۱) حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر کوئی منکر اور بری بات کو ہاتھ سے بدل سکے تو بدل دے یہ مقتضائے ایمان ہے اگر یہ نہ کر سکے تو پھر زبان سے کہے اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو پھر دل سے برا جانے اور یہ ایمان کا سب سے کم درجہ ہے۔ والد صاحب مرحوم کا ارشادِ گرامی اس بات کو واضح کرتا ہے۔

اللہ کا خاص الخاص تعلق:

''ہر اولاد تو والدین کو عزیز اور محبوب ہوتی ہے لیکن اس میں بھی کچھ خاص الخاص ہوتی ہیں ۔تم کو شاید علم ہو کہ حضرت رائے پوریؒ(۱) نے مولانا منظور نعمانیؒ (۲) سے مولانا الیاسؒ (۳) کے بارے میں فرمایا تھا کہ ''اللہ کا خاص الخاص تعلق بس کسی کسی کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔اور میرے خیال میں اس وقت حضرت دہلوی کے ساتھ اللہ کا تعلق خاص الخاص قسم کا ہے۔

بنام مرتب کتاب

۱۱،اکتوبر۲۰۰۰ء(جدہ)

---

(۱) یعنی مولانا عبدالقادر رائے پوری ہیں حضرت مولانا کا تعلق پنجاب سے تھا اور اصلاح نفس کے لئے حضرت عبدالرحیم رائے پوری کے پاس قیام فرمایا اور وہیں قیام کر گئے ۔ بہت سے علمائے حق نے آپ سے بیعت کی اور اصلاحِ نفس کے لئے مرجع الخلائق بنے ۔جن میں مولانا علی میاںؒ اور مولانا منظور احمد نعمانیؒ خاص طور پر قابل الذکر ہے۔

(۲) حضرت منظور نعمانیؒ سنبھل کے رہنے والے تھے۔تحصیلِ علوم دار العلوم دیو بند میں مکمل کی۔مولانا علی میاں صاحبؒ مرحوم سے خصوصی تعلق اور دوستی تھی ۔دار العلوم ندوۃ العلماء میں حدیث کا درس کئی برس تک دیا،آپ کی علمی یادگار ''الفرقان'' آج بھی ایک وقیع اور دینی رسالہ مانا جاتا ہے۔

(۳) حضرت مولانا محمد الیاسؒ دہلوی کا تعلق کاندھلہ کے صدیقی مشائخ کے گھرانے سے تھا،بگڑتی ہوئی دینی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ نے دہلی کے قریب میوات علاقہ میں مستقل طور پر قیام کیا اور ان کی اصلاح کی اور ان کو اسلامی تعلیمات سے مانوس کرایا،موجودہ تبلیغی جماعت کی بنیاد آپ نے رکھی۔

عامل پر اعتبار:

''میرے حالات کی گردش اور معاملات کی تنگی (۱) کی وجہ سے میرے شیخ ،قاری صاحب بھی فکرمند رہتے ہیں ۔خود بھی دعائیں کرتے ہیں اور دوسروں سے دعاؤں کی گذارش کرتے ہیں ۔اگر کسی معتبر عامل کی اطلاع ملتی ہے تو مجھے خود لے بھی جاتے رہے ہیں (۲) لیکن ہمیشہ اس بات کی تاکید ضرور کی کہ یہ سب اسبابِ ظاہری ہیں اصل توجہ ہمیشہ اللہ رب العزت ہی کی طرف رہنی چاہئے کیونکہ وہی کارساز ہے۔اور بغیر اس کے حکم اور رضا کے کوئی کام نہ بن سکتا ہے اور نہ بگڑ سکتا ہے۔

گذشتہ ہفتہ ایک عامل صاحب خود گھر آئے ،۔۔۔۔نام ہے اور مجھ سے بخوبی واقف ہیں ۔امی مرحومہ کا نام پوچھا اور اپنے حساب سے کچھ اٹکل لگائی اور بتایا کہ اثر تو ہے۔میں نے کہا کہ اتاریئے تو کہا کہ گھر پر آیئے اور کچھ سامان بھی ساتھ لانے کی ہدایت کی ،اسی رات عبداللہ سلمہ نے بتایا کہ سب سے زبردست سحر اور نظر بد کا اثر نبی کریم ﷺ پر ہوا تھا۔لیکن کہیں مرقوم نہیں ہے کہ حضور مکرم ﷺ کسی عامل کے روبرو بیٹھے ہو اور نظر اتروائی ہو یا سحر اتروایا ہو۔(۳)

(۱) عمر کے آخری مرحلے میں والد صاحب مرحوم تجارتی نقصان اور صحت میں گراوٹ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔گو اس میں آپکے رفقاء و اقارب کافی مددگار ثابت ہوئے لیکن ذمہ داری کا احساس والد صاحب مرحوم کو پریشان کرتا تھا۔بعض حضرات کا کہنا تھا کہ جادو کا اثر ہے۔

(۲) علمائے کرام اور اہل اللہ سے تعلق کی وجہ سے بعض حضرات عاملین سے رجوع کرنے کو کہتے اور والد صاحب مرحوم اس کے مقتضی پر عمل بھی کرتے۔

(۳) نبی کریم ﷺ بے شک اللہ تعالی کے سب سے محبوب نبی و انسان تھے ۔لیکن اس کے باوجود بشری تقاضوں اور تکلیف سے ان کو گزرنا پڑتا تھا۔جس جادو کا تذکرہ ہے وہ یہودی لبید بن اعصم نے کیا تھا اور سوۂ فلق اس سلسلے میں نازل ہوئی۔

صرف قرآنی آیات کا مستقل ورد کریں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ عبداللہ سلمہ کی اس بات سے اس قدر مطمئن ہوا کہ ان عامل صاحب کے یہاں جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور پابندی سے منزل (۱) کا دور شروع کر دیا۔ الحمدللہ اس قدر تبدیلی محسوس کر رہا ہوں کہ شکر ہی شکر ہے''۔

بنام مرتب کتاب
۱۴ ستمبر ۲۰۰۱ء

(۱) منزل سے مراد وہ قرآنی آیات ہیں جن کا ثبوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جادو کی توڑ میں مروی ہے۔ ان آیات کو حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ نے ایک کتابچہ کی شکل میں مرتب کیا ہے۔

سالگرہ کی تقریب اور دینی احکام:

''۱۵ نومبر کو تمہاری سالگرہ تھی لیکن نہ جانے کیوں یوسف عظیم جیسی شخصیت، ایسی خرافاتی رسوم کو اتنی اہمیت دیتی ہے۔(۱) تم تو ماشاء اللہ سب سے زائد سمجھ دار اور حوصلہ مند ہو۔ انشاء اللہ تم رسولِ مکرم کی سنتوں کو زندہ کرو گے اور یہ تو ایک بدعت ہے(۲) جس کے لئے بدعتی، بدعتِ حسنہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں، جبکہ ہمارے کبار کا متفقہ فرمان ہے کہ بدعت بدعت ہے خواہ اس کو حسنہ کہو یا سیئہ۔(۳)

کسی نے اس تاریخ کو مبارکباد دیدی تو فیھــــــا ورنہ الحمدللہ۔ اس تاریخ کا اہتمام اور انتظار کرنا اور پھر کسی بھی کوتاہی یا کمی پر دل برداشتہ ہونا۔ میری نظر میں نہ مناسب ہے اور نہ احسن''۔

بنام مرتبِ کتاب

۲۳ نومبر ۲۰۰۱ء (جدہ)

---

(۱) نومبر ۲۰۰۱ء میں راقم السطور نے حیدر آباد (دکن) کا سفر کیا تھا۔ اس سفر میں والد صاحب کے قریبی رفقاء کے اہتمام اور عنایت میں حیدر آباد کے مختلف تاریخی یادگار دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اسی دوران ۱۵ نومبر کو حیدر آباد میں اس عاجز کی سالگرہ آ گئی جس کے لئے اپنی کم عقلی کیوجہ سے ایک جمِ غفیر کو پہلے سے بتا دیا۔ فون میں خرابی کیوجہ سے بات نہ ہو پائی جس پر احمقانہ طور پر شکایت کا اظہار کر دیا۔ والد صاحب مرحوم نے نصیحت اور امر بالمعروف کا طریقہ اپنایا گو اس میں ان کے حسن ظن کا مظاہرہ صاف طور پر عیاں ہے کہ وہ اس عاجز سے کس قدر امید رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی امیدوں پر قائم رکھیں۔ آمین

(بقیہ حواشی اگلے صفحے پر)

(بقیہ حواشی پچھلے صفحے سے)

(۲) سالگرہ کا اہتمام اور اس کا منانا ایک وبا اور اجتماعی مرض کی طرح اسلامی معاشرہ میں جاری وساری ہوتا جارہا ہے۔ اس کی اہم وجہ مغربی تہذیب اور تمدن سے تقرب اور مشابہت ہے اور فضول خرچی اور اسراف وتبذیر کا ایک نیا انوکھا طریقہ بھی۔ نصاری حضرت عیسی علیہ السلام کی سالگرہ کو ۲۵ دسمبر کو بہت دھوم دھام سے پورے یورپ اور امریکہ میں مناتے ہیں اسی طرز پر مسلمان بھی اپنے اقارب اور بچوں کی سالگرہ اپنے اپنے گھروں میں بہت دھوم دھام سے منانے لگے ہیں۔

(۳) علمائے دین سے قربت اور ان کی صحبت نے والد صاحب مرحوم کے اصول الدین بہت پختہ اور بنیادی طور پر مضبوط کر دیئے تھے۔ چنانچہ بدعت کو بدعتِ حسنہ اور بدعتِ سیئہ کی تفریق اور تقسیم کو ہرگز برداشت نہیں کرتے۔

بعض دینی احکام جن ثبوت قطعی طور پر قرآن اور حدیث سے ثابت نہیں ہیں ان کو بعض علمائے کرام نے بدعتِ حسنہ قرار دیا۔ حدیث نبوی کا مفہوم ہے کہ دین میں ہرنئی چیز بذعت ہے اور ہر بدعت ضلالت اور گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا خاتمہ جہنم ہے۔"

چنانچہ ان علمائے کرام کو ضروری تھا کہ اس کو بدعت کے علاوہ کوئی نام دے دیں نہ کہ بدعت جو کہ (حدیث شریف میں آیا ہے) حوض کوثر کے پانی سے محرومی کا نتیجہ بنے گے۔ و العیاذ باللہ

لیکن سالگرہ اور دیگر رسومات قطعاً بدعت ہیں اور اس میں شائبہ نہیں خاص طور پر اگر یہ اہل اللہ اور اولیاء کے عرس کی شکل میں منائی جائیں۔

والدین کے احباء کا خیال:

''تم نے عظیم اختر (۱) کے لئے لکھا ہے کہ والدین کے احباء کا خیال اس خیال سے کرنا کہ گویا والدین کی تکریم و تعظیم اور عزت و فضیلت نظر میں رہتی ہے تو اس ضمن میں ایک واقعہ لکھتا ہوں۔ میں نے اپنے حضرت قاری صاحب دام ظلہ (۲) سے فرمایا کہ ایک حدیث نبوی شریف کا متن ہے کہ والدین کے چہرے پر رحمت کی نظر ڈالنے سے ایک حج کا ثواب ملتا ہے اور میرے والدین تو رخصت ہو گئے ہیں اب اگر میں اقارب اور احباب یا جو افراد ان سے متعلق رہے ہیں ان پر نظر ڈالوں (۳) تو کیا ایک عمرہ کا ثواب مل جائے گا؟ قاری صاحب مسکرائے اور فرمایا کہ آپ کی نیت پر ہے''

بنام مرتب کتاب
۱۳ ستمبر ۲۰۰۱ء (جدہ)

---

(۱) عظیم صاحب والد صاحب کے دہلی کے زمانہ میں بہت قریبی دوست تھے۔ ان کے والد صاحب علیم اختر تھے۔ یہ ایک دلچسپ اتفاق تھا۔ جناب علیم اختر صاحب مظفر پور (یوپی) کے رہنے والے تھے اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ سے اصلاحی تعلق تھا۔ والد صاحب اور والدہ صاحبہ ان کے کرم فرمائی کے قصے بہت سناتے تھے۔ دہلی کے قیام کے دوران ہی میں علیم اختر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ان کے فرزند ارجمند جناب عظیم اختر صاحب سے تعلقات ویسے ہی قائم رہے۔ بعد میں والد صاحب نے ترک وطن کر دیا۔ اور سلسلہء ملاقات بہت کم ہو گیا لیکن ہمارے برادر جناب احمد وقار صاحب کی شادی کے دوران کافی عرصے کے بعد ان سے ملاقات ہوئی اور راقم السطور سے تذکرہ بہت شوق و دلچسپی سے کیا۔ عظیم اختر صاحب حکومت ہند کیطرف سے اعلیٰ سرکاری منصب پر فائز ہو کے سبکدوش ہوئے اور دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔

(بقیہ حواشی اگلے صفحے پر)

اہل اللہ کی ہمت:

مولانا عبدالشکور صاحب (خلیفہ مولانا اشرف علی تھانویؒ) جدہ آئے ہوئے ہیں ملاقات ہوئی۔ مولانا عبدالشکور کی عمر ماشاءاللہ ۸۰ سال ہے۔ اللہ تعالیٰ کیسے کیسے ہمت عطا کرتا ہے اور کام لیتا ہے۔

بنام مرتب کتاب
۲۰۰۰ء (جدہ)

(بقیہ حواشی پچھلے صفحے سے) (۲) یعنی حضرت قاری امیر حسن صاحب دام ظلہ، آپ نے حضرت مولانا ابرارالحق صاحب (خلیفہ حضرت تھانویؒ) سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ آپ کا تعلق سیوان (بہار) سے ہے۔ لیکن عرصہ دراز سے ہردوئی میں مقیم ہیں اور تعلیمِ قران میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ پہلے آپ کا اصلاحی تعلق حضرت عبدالقادر رائپوریؒ صاحب سے تھا۔ انکی وفات کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے رجوع کیا اور خلافت سے نوازا گیا۔ والد صاحب مرحوم نے جدہ میں قاری امیر حسن صاحب سے بیعت کی تھی۔ گو والد صاحب نے ذکر کیا تھا کی انکو خواب میں اس بات کی بارہا ترغیب ہوئی کہ حضرت شیخ الحدیث سے بیعت ہو جایں لیکن اس وقت حضرت شیخ الحدیث صاحبِ فراش تھے اور کچھ ہی عرصہ کے بعد وصال ہو گیا۔ انکے انتقال کے بعد والد صاحب تلاشِ شیخ طریقت میں مشغول رہے اور ۱۹۸۸ء میں حضرت قاری امیر حسن صاحب سے بیعتِ اصلاح کی۔ والد صاحب قاری صاحب کی سادگی اور للّٰہیت سے بیحد متاثر تھے۔ جب قاری امیر حسن صاحب جدہ تشریف لائے تو مکان میں والد صاحب کے اصرار اور فرمائش پر ضرور آتے اور اہلِ خانہ کے لئے دعا کرتے۔

(۳) والد صاحبؒ کو اپنے والدین سے بہت لگاؤ اور محبت تھی۔ اور اس لگاؤ اور محبت میں وہ بہت سے افراد کو شامل کر لیتے۔ دادی صاحبہ مرحومہ کی سہلیاں اور انکی بہنوں کا تذکرہ اور خیال ہمیشہ اچھے الفاظ میں ادا کرتے۔ یہاں تک کہ گھر کے قدیم خدام جنھوں نے دادی صاحبہ اور دادا صاحب کی خدمت کی تھی۔ انکا خیال کرتے اور انکی غیبت اور برائی کو قطعاً برداشت نہ کرتے۔ آخری دنوں میں اپنی والدہ صاحبہ کو یاد کر کے آبدیدہ ہو جاتے۔

عصری اور دینی تعلیم کا امتزاج:

''آج مولانا عبدالرحمٰن (۱) سے بات ہوئی، تمہارے بارے میں بتایا کہ داخلہ ہوگیا ہے اور بحمداللہ امتیازی حیثیت حاصل ہوئی ہے۔(۲) بہت خوش ہوئے، پھر جب میں نے بتایا کہ کامرس میں داخلہ کی غرض وغایت یہ ہے کہ ایک انتہائی اہم فریضہ اور سنتِ نبوی جو حالاتِ حاضرہ کی ظلمات میں چھپ گئی ہیں یعنی معاملاتِ دنیوی بطریق شرع محمدی اس کو پھر رائج کیا جائے، کیونکہ بینک کے معاملات پر ہمیشہ یک رخی کام ہوا ہے۔ یعنی ہمارے علماء نے فکر کی ہے اور وہ صرف دین سے واقف ہیں ان کو بینک کے اصول سے کوئی واقفیت نہیں ہے۔ دوسرے وہ حضرات ہے جو دین سے کوئی واقفیت نہیں رکھتے لیکن بینک کے ماہر ہیں۔ اب ظاہر ہے اس مشکل کا حل انشاءاللہ دین کے وہی فرزند نکالیں گے جو دین اور موجودہ معاشی ڈھانچے سے بخوبی واقف ہوں اور انشاءاللہ اس کام کے لئے جن نصیبہ ور افراد کا انتخاب ہوگا اسمیں، میں اور میری اولاد بھی شامل ہونگے'' (۳)

بنام مرتبِ کتاب

۱۲ جون ۲۰۰۰ء، جدہ

---

(۱) مولانا عبدالرحمٰن صاحب کا تعلق حیدر آباد (دکن) سے ہے۔ دینی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں ہوئی۔ اہل اللہ اور اہلِ دین سے ربط واتصال قائم کرنے میں جوانی سے ہی جذبہ تھا۔ چنانچہ مودودی صاحبؒ، مولانا علی میاں، مولانا منظور احمد نعمانیؒ، اور دیگر حضرات سے ملے اور اپنے تاثرات اپنے سلیس قلم سے لکھی ہوئی ''کاروانِ حیات'' میں قلم بند کئے۔ اہلِ بدعت سے اختلافات اور مزید مشکلات کی وجہ سے ہندوستان سے ہجرت کر کے جدہ میں عرصہ سے مقیم ہے۔ اور مسجد الھدیٰ کی امامت کی ذمہ داری بخوبی نبھار ہے ہیں۔ آپ حضرت مولانا ابرارالحق صاحب کے خلفاء اجل میں سے ہے

(۲) بارہویں جماعت کے بعد ہندوستان میں داخلہ ملنا اور وہ بھی عربی تعلیم یافتہ طالب علم کو بہت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے اور اس کے بعد سے والدین کی دعاؤں سے اللہ تعالیٰ نے پونہ کے مشہور اور قدیم تعلیم ادارہ واڈیا کالج میں داخلہ ہوا۔ (بقیہ حواشی اگلے صفحے پر)

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی کی تشریح:

اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا کہ

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلہء شوق نہ ہو طے

کیونکہ مرحلہء شوق، جب طے ہو جاتا ہے یعنی انسان اپنی فکر و نظر کو کسی خاص نقطہ تک محدود کر دیتا ہے تو گویا اس کی فکری اور ذہنی موت ہو جاتی ہے اس لئے ہمیشہ آگے اور آگے بڑھنے کی تمنا رہنی چاہیئے۔ ہم جب اپنے مشائخ اور سابقوں کے لئے دعائیں کرتے ہیں تو اس میں ایک دعا یہ بھی ہوتی ہے کہ یا اللہ ان کے درجات کو بلند فرما اور ہر بلندی سابقہ مدارج سے اونچی اور بالا ہوتی ہے۔"

بنام مرتب کتاب

۲۲ مئی ۲۰۰۰ء، جدہ

(بقیہ حواشی پچھلے صفحے سے) اور وہ بھی بغیر پیسہ دیئے ہوئے۔ اس پر والد صاحب کو بہت خوشی تھی اس وجہ سے کیونکہ والد صاحب کو راقم السطور کو معاشیات اور امور مالیہ میں اسلامی طرز پر کام کرتے ہوئے دیکھنا تھا۔

(۳) والد صاحب مرحوم اس بات پر ہمیشہ تاکید فرماتے کہ اسلام وہ دین ہے جو قیامت تک آنیوالی نسلوں کے لئے ان کی مکمل مشکلات کا حل بخوبی فراہم کر چکا ہے۔ چنانچہ ان احکام قطعیہ کا انکار در اصل اسلام کی حقانیت کا انکار ہوگا۔ والد صاحب مرحوم سودی لین دین میں کافی پختہ اسلامی عقیدہ رکھتے تھے اور بینک سے سودی آمدنی کے استعمال کو بھی قطعاً حرام سمجھتے تھے۔ ان کے نظریہ میں بینک کے اکاؤنٹ صرف کرنٹ ہو سکتے ہیں اور Saving نہیں۔ اور اگر کسی صورتِ حال Saving اکاؤنٹ کے ذریعہ سودی آمدنی فراہم ہو جائے تو اس کے استعمال کو بھی وہ جائز نہیں سمجھتے تھے۔ گو کہ فقہاء کرام اور اسلامی ماہرین معاشیات نے اس کے سودی آمدنی کو بغیر نیت ثواب صدقہ کر دینے کو کہا ہے۔ راقم السطور کے نزدیک یہ ان کا اسلامی احکام اور تعلیماتِ نبویہ سے بے انتہا تعلق اور ربط کا نتیجہ ہی تھا اور کچھ نہیں، اسی ضمن میں آپ غیر سودی کاروبار کی تدوین اور اشاعت کے بہت بڑے حامی اور کوشاں تھے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا ایک قصہ:

''تم اس واقعہ کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا، مجھے یامین بھائی (۱) نے یہ واقعہ سنایا تھا کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے حضور ایک شخص حاضر ہوا اور کسی مسئلہ کے بارے میں پوچھا تو حضرت نے جواب دیا۔اس پر اس شخص نے کہا کہ میں سمجھ نہیں سکا چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ نے دوبارہ اس کو بتایا اور سمجھایا اس پر اس شخص نے کہا کہ سمجھ میں نہیں آیا۔اب شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ پھر کسی اور وقت آؤ تو بتاؤنگا۔چنانچہ وہ شخص چلا گیا۔حاضرین محفل میں سے ایک نے پوچھا کہ حضرت آپ نے کسی اور وقت کیوں بلایا ابھی کیوں نہیں جواب دیا۔اور سمجھا دیا۔اس پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میں فکر کی جس بلندی اور سطح پر تھا وہاں سے میں نے اس کو جواب دیا۔لیکن جب اس کی سمجھ میں آیا تو میں اس سطح اور بلندی سے نیچے اترا اور اس کو جواب دیا لیکن پھر جب اس کی سمجھ میں آیا تو میرے لئے اس وقت یہ ممکن نہیں تھا کہ اس بلندی سے نیچے اترتا۔میرے لئے یہ مرحلہ بہت دشوار تھا۔اس لئے اس کو پھر دوبارہ آنے کو کہہ دیا۔(۲)

اللہ کا شکر واحسان ہے کہ اس نے تینوں بیٹے ذہین، ذکی، فہیم، عقیل اور حوصلہ مند عطا فرمائے۔لیکن ہر ایک کا رنگ جدا جدا اور ہر ایک کی بات الگ الگ۔ان تینوں میں قدرے مشترک یہ ہے کہ یہ ہمارے بیٹے ہیں اور امت مسلمہ کے لائق فرزند انشاء اللہ۔لیکن یوسف عظیم سلمہ کی بات کچھ اور ہی ہے۔یہ بات قاری امیر حسن صاحب، صوفی عبد الرحمٰن صاحب اور دوسرے اکابرین نے کہی ہے۔اس لئے تم یہ دعا ضرور مانگا کرو۔

---

(۱) یعنی مولانا محمد یامین عثمانی صاحب جو آپکے رشتے میں بھائی ہوتے ہیں اور آپکے جدہ منتقل ہونے کے بعد آپکی دینی رہنمائی کرتے رہتے۔عرصہ دراز جدہ میں رہنے کے بعد آپ پاکستان منتقل ہوگئے جہاں آپ روحانی تربیت میں مشغول ہیں۔ (بقیہ حواشی اگلے صفحے پر)

"اللھم اجعلنی فی عینی صغیراً وفی اعین الناس کبیراً"

اب اللہ کے فضل سے تم فکر ونظر کے جس مرتبے اور درجات عالیہ پر فائز ہوا اس پر دوسرے نہیں ہیں۔ میری مراد خاندان کے دوسرے افراد بقول تمہارے عرفی عبید بھائی (۳) کے کہ علیم ماموں کسی کو فکر ہی نہیں ہے کہ کہاں جارہا ہے اور یہ بات کسی کی بھی نظر میں اہمیت کی حامل نہیں۔

تم دوسروں کو جو خطوط لکھتے ہو وہ اپنی فکر ورسا کی مطابقت سے، تمہارے ذہن میں اس وقت یہ بات نکل جاتی ہے کہ تمہارا مخاطب کس حد تک بالغ نظر اور کشادہ قلب ہے۔

مجھے ادھر ادھر سے معلوم ہوا کہ لوگوں نے کہدیا کہ ان کے خطوط تو بڑے فلسفیانہ ہوتے ہیں اور ایسے خطوط کو پڑھنے کے لئے وقت چاہئے۔ اب ظاہر ہے ایسے کام کے لئے وقت نکالنا ایسے افراد کے لئے کتنا دشوار ہے۔ (۴)

اس لئے ہر ایک کو اس کی ذہنی سطح کی مطابقت سے خط لکھا کرو کیونکہ تم تو اپنا قیمتی وقت صرف کرتے ہو اور وہاں ردی کی ٹوکری مستعد رہتی ہے ایسے خطوط کو ہڑپ کرنے کے لئے"

بنام مرتب کتاب

۲۲ مئی ۲۰۰۰ء جدہ

(بقیہ حواشی پچھلے صفحے سے)

(۲) سعودی عرب میں بارہویں کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد، راقم السطور ہندوستان آ گیا، اکثر وبیشتر اسلامی احکام سے بے اعتنائی دیکھ کر بہت رنج ہوتا ہے اور سعودی عرب میں مقیم اقارب اور احباء کو اس نعمتِ عظمیٰ پر شکر کرنے کو لکھتا، لیکن جیسا کہ والد صاحب مرحوم کے خط سے ظاہر ہے کہ اسے شکر کم اور مضائقہ زیادہ ہوتا ہے۔ والد صاحب مرحوم نے ایک بہت اہم دعوتی طریقہ انداز کو واضح کیا اور وہ ہے لوگوں کی فکر کے مطابق ان سے بات کرنا۔

(بقیہ حواشی اگلے صفحے پر)

ترمیم اور تصرف میں فرق:

''تم نے علامہ اقبالؔ کے ایک شعر کو لکھا اور لکھا کہ ''ترمیم'' کی ہے۔ ترمیم کا لفظ صحیح نہیں ہے۔ اس ضمن میں ترمیم نہیں کہتے ہیں بلکہ ''تصرف'' کہتے ہیں۔ کیونکہ ترمیم کا اختیار اس کو ہوتا ہے جو صاحبِ شعر سے زائد اس فنِ شاعری کا ماہر ہو۔ اس لئے تصرف کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ تصرف تو کوئی چھوٹا اپنے بڑے پر کرسکتا ہے''۔

بنام مرتب کتاب

۲۳ اگست ۲۰۰۱ء جدہ

تضمین کے معنی:

''اگر شعر کا ایک مصرعہ وہی ہوتا جو شاعر نے کہا ہے اور دوسرا مصرعہ خواہ وہ مصرعہ اولی ہو یا مصرعہ ثانی اس کو بدل دیا جائے تو اس کو ''تضمین'' کہتے ہیں۔

بنام مرتبِ کتاب

۲۳ اگست ۲۰۰۱ء جدہ

(بقیہ حواشی پچھلے صفحے سے)

(۳) والد صاحب مرحوم کی خالہ زاد بہن کے صاحبزادہ امریکہ سے تعمیر میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی اسی کے دوارن ان کا تعلق تبلیغی جماعت امریکہ سے اور مستحکم ہوگیا۔ ہندوستان کے واپسی کے سفر میں آپ نے حج ادا کیا اور والد صاحب مرحوم کے یہاں قیام کیا۔ موصوف آج کل دہلی میں مقیم ہے اور تجارت کرتے ہیں۔

(۴) حضرت مولانا فقیر محمد نقشبندی صاحب مدظلہ نے اس واقعے کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ صاحب اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے متعلق نقل کیا ہے جس میں حضرت حکیم الامتؒ طالبِ علمانہ کسی مسئلہ پر شیخ الہندؒ سے استفسار کیا اور بعینہ ویسا ہی واقعہ پیش آتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ واقعہ انہی حضرات کا ہو اور ممکن ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کے ساتھ بھی واقعہ پیش آیا ہو۔

''کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں'' کی تشریح:

''علامہ اقبالؔ کا ایک اچھا قطعہ لکھ رہا ہوں اس کو یاد کرلو

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں
غلامِ طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی میری فطرت ہی لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

نوشیروانِ عادل جمشیدؔ کے پاس ایک پیالہ تھا اس میں جب وہ شراب ڈالتا تھا تو اس میں دنیاوی حالات و معاملات کا عکس دکھائی دیتا تھا۔ گویا وہ ساغر جہاں بینی کرتا تھا لیکن بذاتِ خود کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا جب تک جمشید اس میں شراب نہیں ڈالتا تھا کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا گویا اس ساغر کی جہاں بینی شراب اور جمشید کے اشتراک کی محتاج تھی برعکس اس کے شاعر، شکر ادا کرتا ہے کہ جہاں بینی میری فطرت تو ہے لیکن میں کسی غیر اللہ کا محتاج نہیں ہوں''۔

بنام مرتب کتاب
۲۳ اگست ۲۰۰۱ء جدہ

علامہ اقبال کے ابتدائی زمانہ کا شعر:

''تم نے علامہؒ کے جس شعر(۱) کا حوالہ دیا ہے وہ ان کے ابتدائی دور کا شعر ہے اور اس غزل کو قوالوں نے خوب گایا ہے۔ بلکہ پاکستان میں اس غزل کو خوب مٹک مٹک کر بھی گاتے ہیں لیکن یہ شعر معنوی حیثیت اور عقائد کی رو سے اچھا شعر نہیں ہے کیونکہ مومن کی پہچان یہ یہی بتائی گئی ہی کہ وہ ایمان لاتا ہے بالغیب کیونکہ دیکھنے کے بعد تو کفار اور مشرکین بھی یوم الآخر کو ایمان لے آئینگے۔

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے　　بتا کیا تو میرا ساقی نہیں ہے؟
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم　　بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

نعوذ باللہ، اب خود سوچو کہ رب کریم کی شان میں کوئی بخیلی کا لفظ استعمال کرے تو کیسے اس کو صحیح مان لو لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دیگر اشعار بھی مہمل ہیں۔ اب یہ کام آپ کا ہے کہ صحیح انتخاب کریں(۲)''

بنام مرتب کتاب
۲۳ اگست ۲۰۰۱ء جدہ

---

(۱) راقم السطور نے والد صاحب مرحوم کو یہ شعر تحریر کیا تھا۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں جبینِ نیاز میں

(۲) علامہ اقبالؒ کے بعض اشعار اور خاص طور سے ابتدائی دور کے افکار و آراء اعتراض اور تنقید سے بالاتر نہیں رہے۔ نقوشِ اقبال میں مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا کہ علامہ اقبال کی مدراس کی بعض تقاریر ایسی تھیں جس میں اسلامی عقیدہ کی امورِ مسلمہ پر عجیب وغریب اشکالات ظاہر کئے گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کا علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ وغیرہما سے رجوع کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنی دینی اصلاح کے لئے ہمیشہ خواہش مند رہے۔

خداتعالی کی شان کی تکریم ولحاظ:

''علامہ کے ابتدائی دور کا ایک شعر ہے

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے

قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

اس کی بڑی تعریف ہوتی ہے۔علامہ ارشد گورگانی مرحوم جو اس دور کے اساتذہ میں تھے انہوں نے بھی تعریف کی لیکن اہلِ لکھنؤ کے سخنواران کا کہنا ہے کہ ''سمجھ'' میں ذم کا پہلو ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ عالم الغیب دھوکا کھا جائے۔(نعوذ باللہ)

بہر حال بہت احتیاط کی ضرورت ہی اور خود علاّمہ اقبال نے فرمایا ہے

خوشا اے دل بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا

ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں (۱)

بنام مرتب کتاب

۲۳/اگست ۲۰۰۱ء جدہ

(۱) والد صاحب مرحوم اس بات کا پورا خیال اور توجہ کرتے کہ توحید اور اللہ سبحانہ وتعالی کی ذاتِ کریمہ کی شانِ تعظیمی میں کس قدر کمی نہ ہو جائے۔اس کا بہت بڑا صلہ والد صاحب مرحوم کے رشتہ کے بھائی جناب مولانا محمد یامین عثمانی صاحب کی صحبت سے مستفیض ہونا اور وہ بھی کئی سال کے عرصہ کے لئے سعودی عرب کی زمین پر۔

کلمہء طیبہ کی تشریح اقبالؔ کے شعر کے مدنظر:

لبالب شیشہء تہذیب حاضر ہے مئے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانہء الّا

جیسا کہ تم کو علم ہے کہ اقرار توحید کا بنیادی کلمہ۔کلمہ طیبہ اور اس کے دو جزء ہیں

لا الہ۔نہیں ہے کوئی معبود الّا اللہ۔سوائے اللہ کے

یعنی پہلے تمام معبودان باطل کی نفی کرنا ہے اس کے بعد اقرارِ توحید۔تو علامہ فرماتے ہیں کہ تم ہر بات سے انکار تو کرتے ہو لیکن الّا نہیں کہتے یعنی ان سب سے انکار تو ہے سوائے اس کہ۔ یہ کرونگا"۔

بنام مرتب کتاب

۲۱ جنوری ۲۰۰۱ء جدہ

اردو سیکھنے میں ذوق اور شوق:

"ادبی مطالعہ کے استمرار سے ادبی ذوقِ سلیم بیدار ہو جائے گا۔میں نے اردو بہ حیثیت مضمون صرف دسویں کلاس تک پڑھی ہے۔لیکن اس زبان کو سیکھنے کا ذوق وشوق ہمیشہ رہا اس وجہ سے مستقل پڑھتا رہا۔بسا اوقات سب کچھ بالائے سر گذر جاتا تھا لیکن پھر بھی پڑھتا رہتا تھا اور اب اللہ کا شکر ہے کہ زبان پر قابو ہو گیا ہے۔قدرتِ کاملہ تو کسی کو بھی نہیں ملتی۔بس اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے اس نے ہزاروں لاکھوں سے بہتر زبان عطا فرمائی"۔

بنام مرتب کتاب

۲۵ جون ۲۰۰۰ء جدہ

مستند شعراء کا کلام:

''پڑھو اور خوب پڑھو لیکن ہمیشہ اس بات کا خیال رہے کہ مستند اور اچھے شعراء اور ادباء کی نگارشات زیرِ مطالعہ رہیں (۱)۔ نواب جعفر علی خان اثر کی دلیل کی رو سے تم کو، عبداللہ اور وقار کو یہ شرف حاصل ہے کہ تمہاری دادی اور نانی (۲) کا شمار اہلیانِ زبان میں ہوتا ہے۔ اب اس شرف کو اپنے ذوق وشوق سے وہ رنگ وروغن عطا کرو کہ زبان وادب کی قوس وقزح بن جائے۔ تمہارے شیخ (۳) بہت اچھا لکھتے تھے۔ مولانا دریابادیؒ (۴) کو پڑھو تو زبان کا انوکھا لطف ملے گا''۔

بنام مرتب کتاب

۲۵ جون ۲۰۰۰ء جدہ

---

(۱) جدید طرز کے شعراء اور ادباء سے والد صاحب کو کوئی خاص تعلق اور دلچسپی نہیں تھی۔ بلکہ بعض شعراء اور ادباء کے اندازِ تحریر سے کوفت محسوس ہوتی اور فکر مند ہوتے کہ نہ جانے اردو کا مستقبل کیا ہوگا۔

(۲) ہماری دادی کا تعلق ملا احمد جیون (صاحب تفسیرات احمدیہ اور اورنگ زیبؒ کے زمانہ کے بڑے بزرگ) کی خانوادہ سے تھا اور ہماری نانی صاحبہ (بی بی زکیہ رحمۃ اللہ علیہا) کا تعلق حضرت سید عبدالرزاق بانسوی رحمہ اللہ تعالی سے تھا۔

(۳) اس عاجز نے جدہ میں حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت اصلاح کی تھی۔ والد صاحب مرحوم ان کے انداز بیاں اور ادبی تراکیب کے بہت بڑے مداح تھے اور فرماتے تھے کہ حضرت مولانا شعر کو بہت برمحل اور مناسب ذکر کرتے ہیں۔

(۴) یعنی مولانا عبدالماجد دریابادیؒ۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ اودھ سے تعلق رکھتے تھے اور نسباً قدوائی تھے۔ پہلے غیر دینی رجحان تھا لیکن بعد میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ نیز دوسرے اکابر علمائے کرام سے رجوع کیا۔ اور بعد آپ کی تصنیف کردہ تفسیرِ ماجدی ایک مستند اور اہم اردو تفسیر مانی گئی۔ ان کی اہلیہ والد صاحب کی رشتہ میں خالہ ہوتی ہے۔ والد صاحب مرحوم مولانا دریابادی سے وقتاً فوقتاً رجوع کرتے تھے۔

شعری ذوق

''تم نے شعر کے بارے میں لکھا ہے کہ تم نثری قلمکار ہو اس لیے شعر سے دل چسپی نہیں ہے۔آپ کے شیخ حضرت (۱) کو اللہ جل شانہ نے زبردست شعر فہمی کا ذوق اور برمحل استعمال کا سلیقہ عطا فرمایا تھا۔شیخ الحدیثؒ (۲) پر حضرت مولاناؒ کی جو کتاب ہے اسمیں ایک مستقل باب ہے جسمیں شیخ الحدیثؒ کے تحریر کردہ اشعار کا انتخاب پیش کیا ہے۔(۳) یہ بات بھی مصدقہ ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو توصیف وتعریف میں شعر گوئی کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔شعر گوئی اور شعر فہمی ایک مستقل فن ہے جو بفضل رب عنایت ہوتا ہے۔آپ شاعر نہ بنئے لیکن سخن فہم تو بنئے تا کہ جمِ غفیر کو مستقل احساس رہے کہ یوسف عظیم کا تعلق دبستانِ لکھنو سے ہے۔''

بنام مرتب کتاب

۳۰ رستمبر ۲۰۰۰ء جدہ

(۱) حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی صاحب رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔مولانا علی میاںؒ کی شعر فہمی کے والد صاحب بہت مداح تھے۔مولانا علی میاںؒ کا برمحل اشعار کا ذکر کرنا اس خداداد صلاحیت کو عیاں کرتا ہے، بارہا والد صاحب مرحوم نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں مولانا علی میاں ندویؒ کے ادبی ذوق اور منتخبہ اشعار کو ایک کتابی شکل میں پیش کروں۔گو یہ کام بہت اہم ہے اور آنے والی نسلوں اور طلبائے علم کے لیے مفید بھی ہے لیکن میری ادبی کم مائیگی اس کام کو انجام دینے سے حائل ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود دارالعلوم (ندوۃ العلماء) اور دیگر اسلامی یونیورسیٹیوں کے ریسرچ اور پی ایچ ڈی کے طلباء کے لیے ایک اچھا اور قابل دید موضوع ہے۔

(۲) یعنی حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمتہ اللہ علیہ آپ کی ولادت ۱۳۱۵ھ میں سہارنپور میں ہوئی۔آپکا تعلق کاندھلہ کے صدیقی شیوخ کے علمی گھرانہ سے تھا۔ایک طویل عرصہ تک سہارنپور میں مظاہر العلوم میں تدریس حدیث میں مشغول رہے۔عمر کے آخری حصے میں مدینہ منورہ ہجرت کر گئے اور جنت البقیع میں تدفین ہوئی۔

(۳) حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ: جلیل القدر صحابی تھے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی حمایت کے لیے اپنے اشعار اور منظومات کا استعمال کرنے کا حکم دیا۔آپ نے بہت لمبی عمر پائی۔

ہندوستان کے دو محی الدین:

’’گذشتہ ہفتہ، ہندوستان کی بعض تنظیموں نے مولانا ابوالکلام آزاد(۱) کی یوم پیدائش کے موقعہ پر یوم تعلیم منایا، قونصلیٹ میں تقریب ہوئی۔تمہارے ابا کا مقالہ سب سے اہم تھا۔ میں نے ایک خاص تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ ہندوستان کے ایک بیٹے محی الدین اورنگ زیب عالمگیر(۲) نے متحدہ ہندوستان کو پیش کیا اور دوسرے بیٹے محی الدین ابوالکلام آزاد نے اس متحدہ ہندوستان کی تقسیم کو روکنا چاہا اور کامیاب نہ ہو سکا‘‘۔

بنام مرتب کتاب

۲۳ نومبر ۲۰۰۱ء جدہ

---

(۱) مولانا ابوالکلام آزاد کی جائے پیدائش مکہ مکرمہ تھی اور صغرِ سنی میں دیگر اہل خانہ کے ہمراہ کلکتہ منتقل ہو گئے جہاں انکے والد کے زیر نگرانی دینی اور دیگر علوم سے مستفیض ہوئے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں کلیدی کردار نبھایا اور کانگریس کے دو دفعہ صدر بھی منتخب ہوئے۔ انکے خطبات والد صاحب کو بہت پسند تھے اور انکے متحدہ ہندوستان کی فکر سے والد صاحب کو ہم آہنگی تھی، ہندوستان کی آزادی کے بعد وزیر تعلیم کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ گو سردار ولبھ بھائی پٹیل کے مرنے کے بعد انکو امور داخلیہ کا وزیر بھی بنایا جاتا لیکن مولانا آزاد وزیر تعلیم کے عہدہ پر فائز رہے اور بڑے علمی کارنامے اس سلسلے میں انکے عہد میں ہوئے۔

(۲) محی الدین اورنگ زیب عالمگیر مغل بادشاہ شاہجہاں کے بیٹے تھے۔ شاہجہاں کو تخت سے معزول کر کے امور سلطنت کو سنبھالا اور دینی احکام کا اجراء و تنفیذ بہت پابندی سے کیا۔ اس وجہ سے انگریز مؤرخین کے روبرو بہت ظالم اور تنگ نظر حاکم قرار پائے۔ والد صاحب مرحوم اورنگ زیبؒ کی انصاف پسندی اور عدل کے بیحد قائل تھے۔

عمر بن عبدالعزیز کا مقام:

"تمہارا خط ہندوستان ٹائمز میں شائع ہوا، اللہ تعالیٰ مبارک کرے اور زورِ قلم اور اندازِ بیان بہتر سے بہتر کرے۔ (آمین)

تمہارے خط کے لیے کچھ نکات کی وضاحت کرنا ہے۔

ا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ پانچویں خلیفہ نہیں تھے۔(۱) اگر تم اموی خلفاء کا شمار کرو تب بھی انکا نمبر پانچواں نہیں ہے۔ ہاں الحکم کی اولاد میں یہ پانچویں نمبر پر ہیں۔

ا۔ مروان بن الحکم ۲۔ عبدالملک بن مروان (بن الحکم)

---

(۱) سیدنا عمر بن عبدالعزیز اموی خاندان کے چشم چراغ تھے۔ انکی ولادت مدینہ منورہ میں ہوئی۔ انکی نانی ہال حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا خانوادہ تھا۔ جوانی میں بیحد آرام پسند زندگی گزاری کیونکہ انکے والد عبدالعزیز بن مروان حاکم وقت عبدالملک بن مروان کے حقیقی بھائی تھے اور ایک ولایت کے گورنر بھی۔ سلیمان بن عبدالملک کے مرض الموت میں سلیمان کو اس بات کا خدشہ ہوا کہ اتنی بڑی اسلامی حکومت کا حاکم کون ہوگا۔ انفرادی مشورہ حضرت رجاء بن حیوہ الکندی سے ہوا جنہوں نے عمر بن عبدالعزیز کے حاکم بنے کی تاکید فرمائی۔ چنانچہ سلیمان کے انتقال کے بعد عمر بن عبدالعزیز کو حاکم بنایا گیا۔ گو عمر بن عبدالعزیز نے دو سال سے زائد حکومت نہ کی لیکن انصاف پسندی اور رحمدلی کی وجہ سے اسلامی حکومت میں توسع بھی ہوا اور ایک جمِ غفیر نے اسلام قبول بھی کیا۔ راقم السطور نے ٹائمز آف انڈیا میں ایک واقعہ لکھا تھا کہ جب مسلمانوں نے وسطی ایشیاء کے ایک شہر پر قابض ہوئے تو اہل شہر نے حاکمِ وقت حضرت عمر بن عبدالعزیز کو لکھا کہ ہم نے سنا تھا کہ مسلمان پہلے اپنے دین کی تبلیغ کرتے ہیں زبان سے اور سب سے آخر اگر کسی قسم کی دشمنی اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تو جنگ کرتے ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تاکید فرمائی اور صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے حکم صادر کیا کہ سورج نکلنے سے پہلے پہلے پوری مسلمان فوجیں اس علاقہ کو چھوڑ دیں۔ اس فعل پر جب مسلمان فوجی مکمل طور پر وعدہ پورا کیا تو پورا شہر مسلمان ہو گیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز بہت نیک سیرت اور اللہ کے احکام کا احیاء کرنے والے حاکم تھے جسکی وجہ سے ایک بڑی تعداد ہے مؤرخین اور اہل اللہ کی انکو خلیفہ خامس مانتی ہے۔ والد صاحب مرحوم نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ ایسا کہنا کسی عقیدہ کے مدنظر نہیں ہے بلکہ انکی نیک سیرت اور کردار اور اخلاق حمیدہ کے مدنظر ہے اور اس بات کا منکر کسی مسلّم امر اور حکم کا منکر نہیں ہوگا۔ (بقیہ حواشی اگلے صفحے پر)

۳۔ولید بن عبدالملک (بن مروان بن الحکم)

۴۔سلیمان بن عبدالملک (بن مروان بن الحکم)

۵۔سیدنا عمر بن عبدالعزیز (بن مروان بن الحکم)

یہ تو ہمارے عقائد کی بات ہے کہ وہ پانچویں خلیفہ راشد ہیں اور چھٹے خلیفہ راشد بقول مولانا علی طنطاویؒ سیدنا محی الدین اورنگ زیب عالمگیر ہیں۔ یہ سب تم کو اس لیے لکھ رہا ہوں کہ لکھتے وقت ہمیشہ احتیاط برتا کرو کہ حقائق اور عقائد کے تصادم نہ ہوئے پائے۔ بابائے صحافت جالب دھلوی مرحوم (۱) جو انیس احمد عباسی (ہمارے بڑے خالو) کے استاد تھے کا کہنا تھا کہ صحافی ایسا ہونا چاہیے کہ حالات کتنے ہی بدل کیوں نہ جائیں اس کی تحریر گرفت میں نہ آنی چاہیے۔

بہر حال لکھنے کا سلسلہ جاری رکھو اور ہمارے ہندوستان کی مناسبت سے بہتر یہ ہوگا کہ تم ہندوستانی مسلم سلاطین، مسلم حکمران اور مسلم علماء اور صوفیائے کرام کے واقعات کا ذکر کرو۔ کہ کس طرح انہوں نے غیر مسلمین کے ساتھ انصاف و مذہبی رواداری کا سلوک برتا۔

تم شیر شاہ سوری (۳) کے واقعات پڑھو کیونکہ یہ اُن حکمرانوں میں سے ایک ہے جسکی ہندوستانی غیر مسلم بھی تکریم و تعظیم کرتے ہیں۔ اُس کے بے شمار واقعات تاریخ کی زینت ہیں۔''

بنام مرتب کتاب

۲۱ ستمبر ۲۰۰۱ء جدہ

(بقیہ حواشی پچھلے صفحے سے) (۲) بابائے صحافت اور فرقت پھوپھا نے والد صاحب مرحوم کی ادبی رہنمائی میں اہم کردار ادا کیا۔ جالب دھلوی جناب انیس احمد عباسی کے استاد تھے۔ جنکے شاگرد انکے داماد جناب فرقت احمد کاکوروی تھے۔ والد صاحب مرحوم بھی بابائے صحافت سے مستفیض تھے۔

(۳) شیر شاہ سوری ایک بہادر اور مثالی حاکم تھا۔ جس نے ہمایوں کو تخت سے معزول کر دیا تھا۔ گو مدتِ حکومت بہت کم تھی لیکن اس دوران اس نے بہت سے اصلاحی اور تعمیری کارنامے انجام دیئے۔ گرینڈ ٹرنک روڈ اور زرعی اصلاحات اُسی کی دین ہیں۔ ٹوڈرمل کو اس نے منتخب کیا تھا۔

نذرانۂ عقیدت مولانا علی میاںؒ

مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) (جو "علی میاںؒ" کی عرفیت سے مشہور و معروف ہوئے) کے ہمارے والد صاحب مرحوم سے قدیم روابط تھے۔ والد صاحب مرحوم کے عم نامدار جناب صدیق احمد صدیقی صاحب نے ابتدائی عربی و دینی تعلیم ندوۃ العلماء سے حاصل کی تھی اور مولانا علی میاں اس بات کو ہمیشہ یاد رکھتے تھے۔ مزید اس کے والد صاحب مرحوم کے حقیقی ماموں جناب مرتضٰی احمد صدیقی صاحب اس حسنی خانوادہ سے کافی اچھے تعلقات تھے۔ جدہ منتقل ہونے کے بعد مولانا علی میاں سے بستانِ نورولی (جدہ) میں ملاقات سے والد صاحب مرحوم ضرور شرف یاب ہوتے۔ ۱۹۹۰ء میں والدہ صاحبہ نے مولانا علی میاںؒ سے بیعتِ اصلاح کی جس کی وجہ سے اہل خانہ کے تعلقات اور بھی قوی اور مستحکم ہو گئے۔ اور ۱۹۹۸ء میں عاجز بھی حضرت مولاناؒ سے اصلاح کے سلسلے منسلک ہو گیا۔ والد صاحب مرحوم حضرت مولانا علی میاںؒ کی وسیع النظری اور اہل اللہ سے تعلق اور انکی تصانیف میں ادبی چاشنی (جو ان کے علمی اور دینی کاموں کا جزء لاینفک بن گئی تھی) کے بیحد معترف اور شیدائی تھے۔ یہ نظم ان خیالات کی عکاسی کسی حد تک ضرور کر پائے گی۔ مرتب...

ملت کی حمایت میں جسے دردِ جگر تھا
اس باغِ وطن کا وہی شاداب شجر تھا
انجم نہیں افلاک کا تابندہ قمر تھا
اک بوند میں سمٹا ہوا دریائے ہنر تھا

منزل کو پہونچنے کی وہی راہ گذر تھا
افکار کی ظلمات میں وہ نورِ سحر تھا

ٹوٹی ہوئی کشتی میں وہی سینہ سپر تھا
آتا اسے طوفان سے لڑنے کا ہنر تھا

الفاظ کے بندش میں عجب زورِ سحر تھا
ہونٹوں سے نکلتے ہی زمانہ پہ اثر تھا

بڑھتے ہوئے قدموں میں تھکن کا نہ اثر تھا
سمٹا ہوا مہکا ہوا منزل کا سفر تھا

حق گوئی سے باطن کو نہیں اُسکی مفر تھا
اللہ کے شیروں میں وہی شیرِ ببر تھا

شمیم جے پوری کی یاد میں

جناب شمیم جے پوریؒ کا شمار اس زمانے کے صف اول کے شعراء میں ہوتا ہے۔ حضرت جگر مراد آبادیؒ سے شاعری میں استفادہ کیا جسکا اثر آپ کے مرقع اور جید کلام میں ظاہر ہوتا ہے۔ والد صاحب مرحوم اُردو کے اس دورِ انحطاط میں شمیم جے پوری صاحب جیسے جید شعراء کے وجود کو ایک نعمت ہائے عظمیٰ مانتے اور اُردو ادب کے شائقین کو انکے کلام کی قدر کی تاکید کرتے۔ ۱۹۹۷ء میں منعقدہ مشاعرہ میں مہمانانِ خصوصی میں آپ کا بھی نام تھا اور والد صاحب مرحوم کا اس مشاعرہ کے انعقاد میں کلیدی کردار تھا۔ دو سال بعد حضرت شمیم جے پوریؒ کا انتقال ہوا اور سوگواروں نے جدہ میں جلسۂ تعزیت کا انعقاد کیا۔ مختلف شعراء نے اپنے کلام پیش کیئے اس میں والد صاحب مرحوم بھی تھے۔ مرتب

موت کے ہاتھوں نے چھینا ہے شمیم جانفزاء
جس کے نغموں سے ترنم ریز تھی ساری فضا

وہ جگر کا ایک ٹکڑا جو ادب کی جان تھی
کس ترنم سے ملے گا اب جگر کا وہ مزا

جانے والے اب نہ آئیں گے ہمارے درمیاں
حدِ فاصل نے کیا ہے انکو نظروں سے پنہاں

تاحیاتِ دنیوی دیتے رہے ایسا بیاں
کوثر و تسنیم سے دھوئی ہے ہم نے یہ زباں

غم گساروں کی یہ مجلس سوگواوں کا ہجوم
بن گئے تصویر گر یہ اس زمیں کے سب نجوم

کہہ رہے ہیں سب کے سب اہلِ قلم اور اہلِ دل
غمِ شمیم جانفزا کا بن گیا یادِ سموم

(شائع شدہ آواز)

صلاح الدین اویسی کی انتخابی کامیابی پر

سلطان صلاح الدین اویسی، سالار اتحاد المسلمین کی ہندوستان لوک سبھا کے انتخابات میں پانچویں شاندار فتح کے پُرمسرت موقعہ پر، الفاظ و بیان کی یہ سوغات اُن تمام مخلصین بالخصوص اہلِ حیدرآباد کو جنھوں نے درمے درمے، قدمے، سخنے، اس تاریخی مہم کو کامیاب بنایا۔

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

مرزا غالبؔ

ڈاکٹر سید علی محمود صدر بزم اتحاد، جدہ نے مختلف مقامات پر جلوس، شیرینی اور طعام کا اہتمام کر کے اِس جشنِ کامرانی پر اپنے جذبۂ شادمانی کی مُہر ثبت کی۔

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُردم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

اقبالؔ

پھر دکن سے، سوئے دلی جادہ پیما ہو گئے
اب اُٹھیگا غلغلہ جادو بیاں تقریر کا

گردشِ دوراں سے ڈرتے ہیں کہیں مردانِ حق
حلقہ حلقہ کہہ رہا ہے آپ کی زنجیر کا

پھر پشیمانی سے عرق آلودہ پیشانی ہوئی
ہر مخالف ہو گیا قائل تری تدبیر کا

دکن کے کوچہ و بازار کی یہ بازگشت
پھر بنے گی ایک نغمہ شورشِ زنجیر کا

تھا فرارِ زندگی جن کے عزائم کا شعور
وہ بھی اب دیکھیں نتیجہ خواب کی تعبیر کا

بادِ صرصر سے ہراساں ہونے والے سن ذرا
سالار کا سلطان کا نعرہ دیتی تکبیر کا

مخالف دم بخود حیران ہیں خاموش ہیں
اس طرح ہوتا ہے پورا فیصلہ تقدیر کا

لمحہ لمحہ منتظر ایوانِ دِلی اپ کا
قریہ قریہ دیکھ لے گا زور بھی شمشیر کا

احمد اویسی کس قدر فرحان ہیں مسرور ہیں
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دمِ شمشیر کا

دیدنی ہے سیدِ والا گیر کا انبساط
کس قدر جوشِ جنوں ہے قوم کی تعمیر کا

خدائے ذوالجلال و ذوالکرام و ذولمنن
قائم رہے دائم رہے جذبہ یہی تسخیر کا

حامد انصاری صاحب کی نذر

حوصلہ، فکر و نظر

(جناب حامد انصاری سابق سفیر ہند برائے سعودی عرب تھے۔ اس سے قبل آپ قونصل جنرل برائے سعودی عرب اور دائمی نمائندۂ ہند برائے اقوام متحدہ بھی رہے ہیں۔ والد صاحب مرحوم کے آپ سے دیرینہ وقدیم تعلقات تھے۔ ہندوستان کی واپسی پر والد صاحب مرحوم نے انجمن فروغ اردو (جدہ) کیطرف سے مندرجہ ذیل اشعار بطور تمدیح اور ستائش جناب حامد انصاری کو پیش کیے۔)

جاتا ہے کوئی دیس کو جب سے یہ سنا ہے
پردیس میں رہتے ہوئے اس دیس کو دیکھا

خوشبو سے وطن کی میری مہکی یہ فضا
برسوں ہوئے جس دیس میں بچپن تھا گنوا

وہ حوصلہ، فکر و نظر مجھ کو ملا ہے
ماں باپ کی چاہت کی وہ گھنگھور گھٹائیں

مدت کا سفر میں نے بھی لمحوں میں کیا ہے
ممتا کا وہ دریا نہیں جس کا ہے کنارا

گزرا ہے زمانہ مگر بھولا نہیں اب تک
اخلاص میں ڈوبی ہوئی احباب کی چشمک

مانوس ہے میرے لئے اس پیار کی آہٹ
ہر شام کو سنتا ہوں وہی ایک دستک

جاتے ہو وطن کو ذرا ٹھہرو تو سنو
افشاں مجھے بھرنا ہے گہنا مجھے لینا

پردیس میں رہنے کا سبب تم بھی سنو تو
گھر بار کی ہو جائے یہ ارمان ہے اپنا

کہنا تو بہت ہے مگر اتنا ہی سنو تو
ایک بھائی کی تعلیم کا خرچہ بھی ہے دینا

یہ فرض کی بندش ہے جو سہتا ہوں ستم کو
اپنوں کے لئے غیر کی بستی میں ہے رہنا

پوچھے جو کوئی حال تو پیغام یہ دینا
دوری کے ستم سہنے کا رکھتا ہوں قرینہ

لمحات میں خوشیوں کے مجھے بھول نہ جانا
یادوں کے گھروندوں میں سجائے مجھے رکھنا

نذرانۂ تہنیت: ذکرالرحمٰن صاحب

(جناب ذکرالرحمٰن صاحب حکومت ہند کے مختلف اداروں میں وقیع مناصب پر فائز ہو چکے ہیں۔ موصوف نے دہلی میں حکومت ہند سے نشر ہونے والے ریڈیو میں بھی کام کیا۔ بالآخر انکا تقرر جدہ ہو گیا۔ بحیثیت قونصل حج۔ دورانِ ملازمت کافی نئے اور اہم تجربات کئے گئے بسلسلۂ خدمتِ حجاج بیت اللہ جو ہندوستان سے آتے ہیں۔ مزید اسکے انکی نگرانی میں اور جناب افضل امان اللہ کی رہنمائی میں جدہ میں ایک جشنِ آزادی ہند (۱۹۹۷ء) کے موقع پر مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ اس ضمن میں والد صاحب مرحوم کی جانب سے ذکرالرحمٰن صاحب سے مزید قربت اور علمی و ادبی رفاقت ہوگئی۔ جب آپکا تقرر جدہ سے باہر ہو رہا تھا تو انجمن فروغ اردو نے ایک محفل کا انعقاد کیا۔ مندرجہ ذیل اشعار والد صاحب کی طرف سے بطور تہنیت پیش کئے گئے۔

ذکرالرحمٰن کی توصیف میں یوں فرد و بشر ہے
کاشانۂ افلاک پہ رکھتا جو نظر ہے
اردو کی حمایت میں وہی سینہ سپرد ہے
میر کی دلی کا یہی لختِ جگر ہے

نذرانۂ تہنیت: اقبال خان

(والد صاحب مرحوم کے جدہ کے رفقاء میں جناب اقبال خان صاحب بھی تھے جو کہ طویل عرصہ کے بعد ہندوستان واپس آرہے تھے۔ اس ضمن میں والد صاحب مرحوم نے ایک تعارفی و وداعی مقالہ تحریر کیا (جو اس کتاب کا حصہ ہے) اور مندرجہ ذیل اشعار کو بطور نذرانۂ تہنیت پیش کیا۔)

کون رخصت ہورہا ہے کس کے جانے کا خیال　　لمحہ لمحہ کر رہا ہے ہر خوشی کو پائے مال
کس قدر مغموم ہے احباب کا جمِ غفیر　　گو سکوتِ لب ہے لیکن دل میں طوفانِ ملال

بن گئے تصویر گریہ یوں محبانِ علیگ
آنکھ میں آنسو سمیٹے ہر گھڑی ان کا خیال

بزم کی زینت بنے یہ رونقِ محفل رہے　　اقبال کا حسن عمل حسنِ تعاون بے مثال
میں دعا دیتا ہوں ان کو سب کہیں امین بھی　　حافظ و ناصر رہے ان کا خدائے ذوالجلال

کون رخصت ہو رہا ہے کس کے جانے کا خیال
لمحہ لمحہ کر رہا ہے ہر خوشی کو پائے مال

اُردو

(اردو زبان والد صاحب مرحوم کے لئے محض شناخت یا شوق نہیں تھی۔ بلکہ اردو زبان و ادب سے والد صاحب مرحوم کو گہرا قلبی اور روحانی لگاؤ تھا۔ قلبی اس لئے کہ کیونکہ یہ انکی مادری زبان تھی اور لکھنؤ (جو اردو ادب کا ایک مسلّم اور وقیع گہوارا تھا) میں انکی ولادت ہوئی اور عمر کے ابتدائی مراحل وہیں طے ہوئے۔ روحانی اس وجہ سے کیونکہ والد صاحب مرحوم کو اردو ادب کی دینی جامعیت اور دین کی اشاعت میں اسکے موزوں ہونے پر پورا اعتماد تھا۔ مزید اسکے اردو ادب میں دینِ حنیف کا منفرد ذخیرہ بھی اس روحانی تعلق اور لگاؤ کو اور بھی محکم بنائے۔ چنانچہ جب اردو ادب کی رعنائی اور خوبصورتی کا مشاہدہ بلاد عرب میں رہنے والے ایک جمِ غفیر کو کرنے کا موقع ملا تو والد صاحب مرحوم اس سلسلے میں منعقد مشاعرے میں پیش پیش رہے اور کلیدی کردار نبھایا۔ اسی ضمن میں والد صاحب مرحوم نے سامعین کو اردو کی مدح اور ستائش میں کہی گئی ایک نظم سے محظوظ کیا۔ جشنِ زریں کے موقع پر منعقد مشاعرے کا آغاز اسی نظم سے ہوا جو بعد میں ''مجلّہ'' میں شائع ہوئی)

میں آج ہوں اردو کے ثناخواں سے مخاطب
غیروں سے نہیں ہوں میں رگِ جان سے مخاطب
سنتا ہے مگر جو میری سنتا ہی نہیں
اردو کے ہوں حلقۂ یاراں سے مخاطب

اردو تیرا ہر روپ ہے صد رنگ ودل آرا
تو راحتِ جاں بن کے رہی آنکھ کا تارا

گلفام کی گلنار کی تسکین ہے اردو
مغموم ہے مظلوم ہے مسکین ہے اردو

غیروں سے شکایت نہیں اپنوں سے گلہ ہے
بے تاب ہے بے چین ہے غمگین ہے اردو

اردو تیرا ہر روپ ہے صد رنگ ودل آرا
تو راحتِ جاں بن کے رہی آنکھ کا تارا

گنگا کی یہ گودی میں پلی اور بڑی ہے
جمنا کی یہ بانہوں میں ہمیشہ سے رہی ہے
اور طرزِ ادا ، شامِ اودھ سے ہی ملی ہے
یہ حسن کی دیوی نہیں اردو کی کلی ہے

اردو تیرا ہر روپ ہے دل آراں
تو راحتِ جاں بن کے رہی آنکھ کا تارا

اقبال کی شریعت کا ذریعہ یہ بنی ہے
شاہوں کے فقیروں کے یہی سر پہ چڑھی ہے
محلات میں کھنڈرات میں گھومی ہے پھری ہے
زنداں میں یہی زورِ بیاں بن کے رہی ہے

اردو تیرا ہر روپ ہے صد رنگ و دل آراں
تو راحتِ جاں بن کے رہی آنکھ کا تارا

اردو تیرے گیسو کو ہم سب نے سنوارا
بندش میں روانی ہے کہ چڑھتا ہے دھارا
آتش ہو کہ چکبست ہو سودا ہو کہ وحشت

الفاظ کی شوکت کا لیا سب نے سہارا

اردو تیرا ہر روپ ہے صد رنگ ودل آرا
تو راحتِ جاں بن کے رہی آنکھ کا تارا

پنڈت کے ماتھے کا تلک بن کے رہی ہے
مُلاّ کی یہ دستارِ فضیلت میں سجی ہے۔
بُت خانہ ہندی میں صنم بن کے رہی ہے
ہر دور میں شائستۂ محفل یہ رہی ہے

اردو تیرا ہر روپ ہے صد رنگ ودل آرا
تو راحت جاں بن کے رہی آنکھ کا تار ا

جوؔہر کے بھی جوہر کا نکھارا تھا اِسی نے
مفلس کو سرِ بزم بٹھایا اِسی نے
سر فروشی کی تمنا کو بڑھایا تھا اِسی نے
للکار کے قاتل کو پکارا تھا اِسی نے

اردو تیرا ہر روپ ہے صد رنگ ودل آرا
تو راحت جاں بن کے رہی آنکھ کا تارا

دوشیزۂ کشمیر کے ہونٹوں پہ رہی ہے
اور ارضِ دکن میں اسے توقیر ملی ہے
بھوپال کی بستی میں فقط زیر ہوئی ہے
بچے کی دعا نالۂ شب گیر ہوئی ہے

اردو تیرا ہر روپ ہے صد رنگ ودل آرا
تو راحت جاں بن کے رہی آنکھ کا تارا

وہ گیت کی محفل ہو یا بزمِ غزالاں
وہ جشن ہو نوروز کا یا جشنِ بہاراں
فریاد ہو بے داد کی یا ذکرِ نگاراں
سوغاتِ زباں ، ذکر وبیاں درد کا درماں

اردو تیرا ہر روپ ہے صد رنگ ودل آرا
تو راحت جاں بن کے رہی آنکھ کا تارا

گھونگھٹ کی ادائیں ہوں کے پنگھٹ کے نظارے
دولت کے پجاری ہوں کے افلاس کے مارے
سنجوگ کی لذت ہو کے فرقت کے شرارے
بنتا ہے یہاں حسنِ بیاں تیرے سہارے

اردو تیرا ہر روپ ہے صد رنگ ودل آرا
تو راحت جاں بن کے رہی آنکھ کا تارا

یہ میرؔ کی غالبؔ کی نہیں سب کی زباں ہے
افلاک سے اتری ہے بڑی شوخ بیاں ہے
صدیوں سے گزرنے پہ بھی نوخیز وجواں ہے
اس دیس کی بیٹی ہے یہی اس کا مکاں ہے

اردو تیرا ہر روپ ہے صد رنگ ودل آرا

تو راحت جاں بن کے رہی آنکھ کا تارا

جس دیس کی بیٹی ہے اس دیس کے تم ہو
چاہت کے طریقوں پہ ذرا غور تو کر لو
بچوں کو پڑھاتے نہیں انداز تو دیکھو
دامن سے جو چمٹی ہے تو چھوڑے نہیں تم کو

اردو تیرا ہر روپ ہے صد رنگ ودل آرا
تو راحت جاں بن کے رہی آنکھ کا تارا

جنت کی مماثل یہ زمیں اس کا وطن ہے
آکاش سے اتری ہے زمانے کا چلن ہے
شاھین کا قُمری کا بیاں اس کا لحن ہے
اغیار کی بستی میں بھی شاداں ومگن ہے

اردو تیرا ہر روپ ہے صد رنگ ودل آرا
تو راحت جاں بن کے رہی آنکھ کا تارا

گھنگھرو کی چھما چھم میں صدا اسکی سنی ہے
ساغر کی کھنک قلقلِ مینا سے بنی ہے
افسردہ ومغموم کی راحت یہ رہی ہے
منزل سے جو بھٹکی ہے تو کوٹھوں پہ چڑھی ہے

اردو تیرا ہر روپ ہے صد رنگ ودل آرا
تو راحت جاں بن کے رہی آنکھ کا تارا

اردو کی حمایت میں علم تم نے اٹھایا
یہ زخم ِ دل وجاں پہ مرہم تم نے لگایا
کہنے کی نہیں بات مگر حق تو یہی ہے
وہ کہتے رہے ، تم نے اسے کر کے دکھایا

اردو تیرا ہر روپ ہے صد رنگ ودل آرا
تو راحت جاں بن کے رہی آنکھ کا تارا

تعزیتی مقالے

والد صاحب مرحوم کے اچانک انتقال کے حادثے کی خبر سنکر بہت سے حضرات دم بسکوت رہ گئے۔ شائداسمیں آپکی ملنساری اور اپنائیت کا سلوک تھا جس نے اتنے لوگوں کو آپ کے فراق پر غم زدہ کردیا۔

عاجز نے بعض حضرات سے خصوصی گذارش کی کہ والد صاحب مرحوم کی یاد میں کچھ تحریری طور پر پیش کردیں۔ چنانچہ بعض مقالے موصول ہوئے جنکو آنے والے صفحات میں قاری پڑھ سکینگے۔

ان مقالہ میں تنوع بدرجہااتم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ عنفوان شباب کے زمانہ کی جھلکی کے لئے جناب نیر مسعود صاحب کا مقالہ ہے جو لکھنؤ کی ایک خاص اندازِ طنز ومزاح کی عکاسی کرتا ہے اسکے بعد بیگم سید امیر حسن نورانی صاحبہ کا مقالہ دھلی کے زمانہ قیام کی علمی تصویر پیش کرتا ہے۔ اسکے بعد جناب امین حسین صاحب کا مقالہ والد صاحب کے بلادعرب کے سفر کے مقاصد پیش کرتا ہے اور اسکے بعد دوسرے حضرات کے مقالے انکے آخری ایام حیات کی ایک سنجیدہ اور صحیح تصویر پیش کرنے میں کافی حدتک کامیاب ہوجاتے ہیں۔

مکتوبِ گرامی حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی

(دامت برکاتہم)

(حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ صاحب (عرف علی میاںؒ) کے خواہرزادہ جناب مولانا محمد رابع حسنی ندوی صاحب سے والد صاحب مرحوم کے تعلقات اس وقت سے تھے جب سے آپکا اپنے محترم ماموں کے ساتھ جدہ آنا ہوتا تھا۔اور وہی آپ دونوں کی ملاقات ہوئی۔مولانا علی میاںؒ کے انتقال کے بعد والد صاحب مرحوم نے تاکیدی حکم دیا کہ عاجز مولانا رابع صاحب سے رجوع کرے۔مولانا رابع حسنی صاحب کا مندرجہ ذیل خط ان جذبات اور رشتوں کی عکاسی کرتا ہے۔) مرتب...

''عزیز رشید یوسف صاحب صدیقی سلمک اللہ''

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپکا خط موصول ہوا۔میں حج کے سفر سے دو روز پہلے لکھنؤ پہونچا تھا اور یہ نیت رکھتا تھا کہ آپ کو فوراً خط لکھنا ہے۔اور آپ کے والد ماجد کی تعزیت پیش کرنا ہے۔وہاں مکہ مکرمہ میں فون کے ذریعے آپکی والدہ صاحبہ سے اور آپکے بھائی سے تعزیت کرنے کا موقع ملا تھا۔اور میں نے ارادہ کیا تھا کہ جدہ پہونچے پر گھر جا کر تسکین وتعزیت کے الفاظ کہنا ہے۔لیکن جدہ بہت مختصر وقت کے لئے جانا ہوا اور گھر کا پتہ معلوم نہ ہونے پر جانا دشوار معلوم ہوا۔بہر حال آپکی والدہ صاحبہ سے فون پر بات ہوگئی تھی اور میں نے تسکین کے الفاظ کہدئے تھے۔اس دنیا میں جو بھی آتا ہے اسکو کامیابی سے جانا یقینی ہوتا ہے اور جتنی عمر اللہ تعالیٰ نے مقرر کردی ہوتی ہے اتنی ہی عمر ملتی ہے۔لیکن عزیز اور محبت کرنے والے فرد کی جدائی بہت شاق ہوتی ہے۔باپ بیٹے کا تعلق ایسا ہے کہ بہت صدمہ اور خسارہ کا احساس فطری ہے۔پھر باپ بھی ایسا باصفت اور خوبیوں والا جیسا کہ آپ کے والد تھے انکی

جدائی جتنی شاق محسوس ہوئی ہو کم ہے۔لیکن مسلمان اپنے مالک وخالق کی مرضی پر راضی رہتا ہے۔ جس کا صلہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بہت ہے۔میں آپکی تکلیف ورنج کو محسوس کرتا ہوں اور آپ سے قلبی احساساتِ تعزیت کا اظہار کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کے مرحوم کو اپنے خصوصی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔اور آپ سب پس ماندگان کو صبر ورضا بالقضاء کی ہمت عطا فرمائے اور اس کا اجر عطا فرمائے۔" (آمین)

آپ کے والد صاحب مرحوم کی تدفین مکہ میں ہوئی یہ مزید برکت کی بات ہے۔بیت اللہ شریف کا قرب ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی رحمتیں برابر نازل ہوتی رہتی ہیں۔اللہ تعالیٰ مبارک کرے" (آمین)

والسلام

(مولانا) محمد رابع ندوی

۲۰ مارچ ۲۰۰۲ء

لکھنؤ کے مشاعرے اور علیم کی یاد

جناب نیر مسعود صاحب (لکھنؤ)

کسی ایسے مرحوم دوست کے بارے میں لکھنا جس کس ساتھ صرف لطائف وظرائف اور قہقہوں سے بھرپور یادیں وابستہ ہوں، میرے لئے ہمیشہ مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ علیم ہم لوگوں کے ایسے ہی دوست تھے۔ انکے والد ڈاکٹر عظیم مرحوم میرے والد مرحوم پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کے ملنے والوں میں تھے اور میں نے علیم کو ان کے بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ کبھی کبھی وہ والد صاحب کے پاس آتے تھے۔ کچھ اس رشتے سے اور بہت کچھ ادب کے رشتہ سے۔ میری بھی علیم سے ملاقاتیں رہتی تھیں۔ ان کے دوستوں میں زندہ دلوں کا ایک حلقہ تھا اور یہ سب لوگ ایک ساتھ مشاعروں میں جاتے تھے۔ شاعر اس جرگے سے گھبراتے تھے اس لئے کہ یہ سب ہوٹنگ کے ماہر تھے اور علیم ان میں ماہر خصوصی کی حیثیت رکھتے تھے۔ اکثر وہ کسی ایک شاعر کو خصوصی ہوٹنگ کے لئے تاک لیتے تھے۔ اور ہر شاعر کو ہوٹ کرنے کے بعد اس شاعر کو پڑھوانے کے لئے شور مچانا شور کرتے تھے۔ شاعر بے چارہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہوجاتا تھا کہ یہ لوگ اس کے سوا کسی اور کو سننا نہیں چاہتے۔ پھر جب وہ کلام سنانے کے لئے مائک پر آتا تو اسکو جی بھر کر ہوٹ کر دیتے تھے۔

مجھے سفید بارہ دری قیصر باغ کا ایک مشاعرہ یاد آرہا ہے جس میں انھوں نے ہر شاعر کو ہوٹ کرنا اور لکھنؤ کے ایک ممتاز شاعر کا نام پکارنا شروع کر دیا۔ وہ شاعر اشاروں سے ان لوگوں کو روک رہے تھے مگر ان کا شور اتنا بڑھا کہ ناظمِ مشاعرہ نے یہ کہکر شاعر کو قبل از وقت پڑھنے کی دعوت دے دی کہ اگرچہ ابھی سے آپکو پڑھوا دینا آپکے مرتبے کے خلاف ہے لیکن ''سامعین کے بے حد اصرار سے مجبور ہوکر'' آپ کو زحمتِ سخن دی جارہی ہے۔ ان لوگوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ شاعر

صاحب کمال خود اعتمادی کے ساتھ مائک پر پہنچے اور مطلع کے پہلے ہی مصرعے پر ہوٹ ہو گئے۔ ہوٹنگ کے شور میں انہوں نے مشکل سے ڈھائی شعر پڑھے اور دانت پیستے ہوئے یہ کہ کر بیٹھ گئے ''بیہودہ خود ہی بلاتے ہیں اور خود ہی ہوٹ کرتے ہیں''۔

ایک اور مشاعرہ میں یہ لوگ زبردست ہوٹنگ کر رہے تھے جس پر ایک پہلوان نما شاعر کو جلال آ گیا اور وہ یہ کہہ کر ڈائس سے اترے کہ میں ان لوگوں کو ٹھیک کرتا ہوں۔ وہ واقعی پہلوان تھے اور اس وقت ان کے تیور ایسے کڑے تھے کہ علیم کی پارٹی کو خاموش ہو جانا پڑا۔ وہ پارٹی کے بیچ میں آ کر بیٹھ گئے۔ جتنی دیر وہ بیٹھے رہے پارٹی سے کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔ علیم سخت بے چین تھے۔ لیکن دو چار شاعروں کے بعد ان شاعر کا نام پکار دیا گیا اور وہ ان لوگوں کے درمیان سے اٹھ کر غزل سنانے میں ڈائس پر چلے گئے۔ غزل بھی بڑی مردانہ تھی ایک مصرعہ کچھ اس طرح تھا:۔

ہم ایسے لوگ ہیں شیشے سے پتھر توڑ دیتے ہیں

علیم کی پارٹی سے ایک سریلی آواز بلند ہوئی

میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں

یہ فلم ''چاندنی چوک'' کے ویلن کا مکالمہ تھا جسے وہ بار بار ترنم سے دہراتا تھا۔ اسی کے ساتھ ایک آواز آئی۔

''لڈو ، پیڑے، بالو شاہی''

یہ بھی اسی ویلن کی صدا تھی۔ مشاعرے میں قیامت برپا ہو گئی اور تمام سامعین نے ایسے قہقہے لگائے کہ غریب شاعر کو بیٹھ جانا پڑا۔

ان تفریحات سے قطع نظر علیم کا ادبی ذوق بے حد عمدہ تھا۔ میرا خیال ہے وہ لکھنؤ کی انجمن ادبِ اطفال کے بھی سرگرم رکن تھے۔ وہ لکھنؤ کی زبان کے پرستار تھے۔ ان سے جب بھی

ملاقات ہوتی تو وہ غلط زبان بولنے والوں کی شکایت ضرور کرتے تھے کبھی لطیفہ کے طور پر اور کبھی آزردگی کے ساتھ۔

وہ سعودی عرب میں رہنے لگے تھے اور وہاں بھی عدیم الفرصتی کے باوجود ان کی ادبی دلچسپیاں برقرار تھیں۔ اور وہاں کے ایک اردو اخبار میں ان کی خبریں چھپتی رہتی تھیں۔ کوئی دو سال قبل وہ اپنے بیٹے کی شادی کے سلسلے میں ہندوستان آئے تھے۔ کئی سال بعد ملاقات ہوئی۔ اب انہوں نے داڑھی رکھ لی تھی اور کچھ دیر سنجیدگی سے گفتگو کرتے رہے لیکن اس کے بعد پھر وہی پہلے والے علیم تھے۔ سعودی عرب میں بھی وہ لکھنؤ کی اردو زبان کی طرف سے بحث ومباحثہ کرتے تھے جس کے کئی واقعات انہوں نے سنائے۔ لکھنؤ کے ان شاعروں اور بزرگوں کو یاد کرتے رہے جو اب نہیں رہے تھے۔ پھر ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوئے۔

لیکن سعودی عرب واپس پہنچنے کے بعد ان پر دل کے کئی دورے پڑے۔ آخری دورہ مہلک تھا اور اس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ اس طرح لکھنؤ اپنے عاشق فرزند سے اور ہم لوگ ایک باغ و بہار دوست سے محروم ہو گئے۔

عربوں کے عاشق، اردو کے شیدائی لکھنؤ کے علیم احمد صدیقی کی یاد میں

جناب حسین امین صاحب (لکھنؤ)

حلقۂ احباب میں بلا لحاظ عمر سب کے لئے ''علیم بھائی'' اور ویسے علیم احمد صدیقی نے ۸/ذی الحجہ ۱۴۲۲ھ (۱۹ فروری ۲۰۰۲ء) کل نفس ذائقۃ الموت کے اٹل قانون الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر کے ایک ایسے وقت اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ جب ملت اسلامیہ کے ایک خادم اور بہی خواہ اور اردو دنیا میں بچوں اور بڑوں کے ایک ہر دل عزیز ادیب، خوش گو شاعر مقالہ نگار اور کہانی کار کی حیثیت سے ایک نمایاں مقام حاصل کر چکے تھے اور بحر احمر کے کنارے مملکتِ سعودی عربیہ کے عروس البلاد: جدہ میں سرزمین ہند میں اودھ کے مشہور خطہ کی گنگا جمنی تہذیب کے شہر اور گہوارۂ علم و ادب لکھنؤ کی پہلے ٹاپ کی دو لفظی محاورہ میں سموئی ہوئی تمام لکھنویت کی نمائندہ شخصیت بن چکے تھے۔

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے اس فکر انگیز مشاہدے کی رعایت سے کہ کہیں وبا کو پھوٹ پڑنا اتنی تشویش کی بات نہیں ہوتی ہے جتنی یہ کہ اسکا علاج کرنے والا کوئی نہ ہو۔ شائد یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کسی زبان کی محض شاعر یا ادیب بن جانا اتنی اہم بات نہیں ہے جتنی یہ کہ اُس زبان کے فروغ اس کی ترقی اور بقاء کی فکر کرنے والا بھی کوئی ہو جو میدانِ عمل میں اتر کہ اپنی فکر کو عملی جامہ پہنانے کا عزم اور صلاحیت رکھتا ہو۔

علیم بھائی میں جو ایک زندہ دل، حساس مزاج، باذوق، تیز دم، انجمن آرائی اور محفل

آرائی کے شوقین، میز بانی میں حاتم اور قائدانہ صلاحیت کے حامل تھے۔ یہی وصف تھا جس نے ان کی شخصیت میں چار چاند لگا دیے تھے اور جس کے لئے وہ نہ صرف ہمیشہ یاد کئے جاتے رہیں گے بلکہ انکے حوالے بھی دیئے جاتے رہیں گے۔

ایک زمانہ تھا جب لوگ روزگار کے بہتر مواقع کی تلاش سے زیادہ اعلی تعلیم اور حصولِ مقصد سے اپنا وطن چھوڑ کر سات سمندر پار بیرونی ممالک کے سفر پر جایا کرتے تھے اور مقصد پاتے ہی وطن واپس آجاتے تھے اور اس ملک میں قیام کے دوران انکی تمام سرگرمیاں مقصد کے حصول سے متعلق کاموں تک یہی محدود رہتی تھیں۔ آج حالات عملاً بالکل مختلف ہیں لوگ تعلیم کے لئے اب شائد اتنی بڑی تعداد میں بیرونی ملک کا سفر نہیں کرتے جتنے روزگار کے بہتر مواقع کی تلاش میں جاتے ہیں اور لمبی مدت تک یا ہمیشہ کے لئے وہیں رہ جاتے ہیں۔

ایسے لوگوں کو اصطلاحاً ''امیگرنٹس'' یا ''تارکینِ وطن'' کہا جاتا ہے۔ ان تارکین وطن میں ایک ایسا حلقہ بھی ہوتا ہے جو اپنی زندگی کو صرف کھانے کمانے تک ہی محدود نہیں رکھتا ہے بلکہ زندگی کو جسمانی، روحانی اور نفسیاتی طور پر متحرک، خوش رنگ اور پُر لطف نیز متنوع بنائے رکھنے کہ ان تمام عناصر کو بروئے کار لانے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ جو بالخصوص اسکی اپنی مادری زبان ثقافت اور تہذیب پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جو مل کہ ایک معاشرہ بنا دیتے ہیں۔ یہ عناصر اس حلقے کو اپنی ''طویل زندگی'' اور اپنے معاشرے سے الگ تھلک اور کٹ جانے کے منفی نفسیاتی اثرات سے محفوظ رکھتے ہیں چنانچہ اس معاشرہ میں تعلیمی ادارے، ادبی اور شعری اور ثقافتی انجمنیں معرض وجود میں آتی ہیں جس کے نتیجے میں بچوں کی دینی، عصری اور مادری زبان کی تعلیم کا اہتمام ہوتا ہے۔ اور ذوق کی تسکین کا سامان ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی گھر سے دور ''گھر'' بن جاتا ہے۔ یہ باذوق حلقے جس ملک میں بھی ہوتے ہیں اس ملک کے باذوق حلقوں سے انٹرایکٹ کرتے ہیں یعنی ملتے جلتے ہیں۔ اور

روابط پیدا کرتے ہیں۔جس کی وجہ سے ایک دوسرے کو سمجھنے اور اجنبیت کا احساس کم کرنے میں مدد ملتی ہے۔

ایسے حلقوں کی فہرست میں بھی علیم بھائی کو ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔گویا علیم بھائی بین الاقوامی سطح پر ان اقدار کے توسط سے انسانی وحدت کے استحکام میں سرگرم تھے۔جو بالعموم سبھی قوموں میں مشترک ہوتی ہیں۔مثلاً سبھی زبان کے ادب یکساں جذبات کے حامل ہوتے ہیں۔ اخلاقی ،ثقافتی اور انسانی قدریں بالعموم ہر قوم میں یکساں ہوتی ہیں ورنہ دنیا کی مختلف زبانوں میں محاورے اور انکے اندر چھپے ہوئے جذبات معنی اور مفہوم یکساں نہ ہوئے اور ہم ایک دوسرے کی زبان اور ادب تسلیم نہ کر سکتے۔یہی یکسانیت ہے جو دنیا بھر کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں مدد کرتی ہے۔انھیں ہم خیال اور ہم مذاق بناتی ہے۔

علیم بھائی کے والد جناب عظیم صاحب اسم بامسمّی تھے۔جن کا پورا نام محمد عظیم احمد صدیقی تھا وہ شہر نگاراں لکھنؤ کے قدیم محلّہ کٹرا ابوتراب خان میں مصطفیٰ منزل کے نام سے مشہور و معروف وسیع مکان میں رہتے تھے۔جو آج بھی انکی اولادوں سے آباد ہیں۔عظیم صاحب شہر کے نہ صرف ایک ممتاز طبیب اور جراح (سرجن) تھے بلکہ بے حد ادب نواز، علم دوست، با اخلاق، مخلص، دردمند، اور دوست نواز انسان تھے۔ان کے خمیر میں ظرافت، متانت، اور فہم و فراست کا ایک ایسا امتزاج تھا جس کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب ایک پُرکشش اور محترم شخصیت کے مالک ہوگئے تھے۔علیم بھائی نے بھی اپنے والد کے یہ اوصافِ حمیدہ وراثت میں پائے تھے بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ڈاکٹر عظیم صاحب کی اولاد دراولاد اس وراثت کی حامل نظر آتی ہے۔

علیم بھائی اپنے گھر کے ادبی مزاج سے کچھ زیادہ ہی متاثر تھے۔اگر چہ وہ سائنس گریجویٹ تھے لیکن اردو زبان وادب کے بھی رسیا تھے۔چنانچہ ادب کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی

کی ۔جس روانی سے وہ بولتے تھے اسی روانی سے انکا قلم بھی چلتا تھا۔زبان کی صحت کا خاص خیال رکھتے تھے۔غلط تلفظ کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ایسے شخص کو لتھاڑ کرر کھ دیتے تھے۔

لکھنؤ میں علیم بھائی کو اپنے ادبی و علمی ذوق کی تسکین کا خاصہ سامان مل گیا تھا۔میرے ایک دوست اور کلاس فیلو ابصار عبدالعلی نے جو بچوں کے ادیب تھے اور بڑے اچھے مصور تھے،۱۹۵۶ء میں ایک ادبی تنظیم انجمن ادب اطفال کے نام سے قائم کی جس کا مقصد بچوں میں ادبی ذوق پیدا کرنا اور بچوں کے ادب کی تخلیق پر توجہ دینا تھا۔علیم بھائی نے انجمن میں بہت دلچسپی لی اور اس کے نائب صدر بھی ہو گئے ۔انجمن کی ادبی نشستوں میں ممبران اپنی ادبی تخلیقات پیش کرتے ،علیم بھائی کی نگارشات پُر لطف اور با مقصد ہوتی تھیں،ان کی نگارشات کو بچوں کے مشہور رسالوں مثلاً ماہنامہ 'شمع گروپ' کا ''کھلونا''،نسیم بکڈپو سے شائع ہونے والا میگزین ''کلیاں'' بچوں کے ایک اور رسالے ''ٹافی'' میں نمایاں مقام ملتا تھا۔خود میرے ہفت روزہ ''دنیا'' میں ان کے مضامین برابر شائع ہوتے تھے۔جن میں ان کا ایک مضمون بہت مشہور ہوا تھا جو انہوں نے امریکی صدر جون ایف کینڈی پر لکھا تھا جس میں انہوں نے اپنے تاثرات کے لئے بے حد نفیس جملے استعمال کئے تھے۔

بی،ایس سی (B.Sc.) کرنے کے بعد علیم بھائی ایک کمپنی بامبے ڈائنگ میں ملازمت کر لی لیکن جلد ہی الگ ہو گئے پھر انہوں نے نجی طور پر کپڑوں کے ڈزائین تیار کرنے کا کاروبار شروع کرنے کا ارادہ کیا لیکن وہ بھی نہ ہو سکا۔اور پھر ایک دن یہ کہنے لگے ''اب یہاں سے دانا پانی اٹھ گیا ہے''۔''کیوں کیوں علیم بھائی کدھر چلے؟''

''سوئے حرم''

علیم بھائی کے چہرے پر ایک خاص خوشی جھلک رہی تھی۔اور وہ بالآخر ارض پاک پہونچ

گئے اور وہاں کے ''کاسموپولٹین'' شہر جدہ میں بس گئے۔ جب وہ جانے کے بعد پہلی بار لکھنؤ آئے تو ایک دوسرا ہی انداز تھا وحدت کا تصور انہوں نے حقیقت کی شکل میں دیکھ لیا تھا۔

علیم بھائی نے اپنی پہلی ملاقات میں اسلام نظام اور وحدت کے بارے میں تاثر دیا۔ کہنے لگے ''کیا بات ہے؟ ہر مسلمان چاہے وہ جس لسانی یا تہذیبی حلقے سے تعلق رکھتا ہو نماز کے وقت اس کی عبادت میں یکسانیت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ہم لوگ ایک روز صحراء میں پکنک (سیر وتفریح) منانے گئے۔ نماز کا وقت آ گیا کسی نے اذان دی اور وہاں پر موجود کوئی عرب، کوئی ہندوستانی، کوئی چینی، کوئی جاپانی، کوئی سوڈانی سب کے سب یکساں خشوع وخضوع کے ساتھ نماز کے لئے صف باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ چینی مسلماں نے نماز پڑھائی اور ایسا تھا کہ ہم سب ایک ہیں''! علیم بھائی سے ان کی جدہ واپسی تک جتنی ملاقاتیں ہوئیں سب میں موضوعِ سخن اسلام رہا، اس کی آفاقی حیثیت پر بات ہوئی۔ ان کے دل میں عربوں کے لئے احترام وتعظیم کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو چکا تھا اور یہ جذبہ بڑھتا ہی گیا۔

سعودی عرب میں رہ کر علیم بھائی نے دو اہم کام کئے، ایک تو اپنے بچوں کی تعلیم پر توجہ دی اور عربی زبان اس طرح پڑھوایا جیسے مادری زبان پڑھائی جاتی ہو، بچوں نے ابتدائی تعلیم ہی عربی میڈیم میں حاصل کی اور اس وقت ان کے بیٹے وقار عظیم انجینیر اور محمد عبداللہ عظیم انجینئر سعودی عرب میں بڑی کمپنیوں میں اچھے عہدوں پر فائز ہیں ماشاءاللہ اور یوسف عظیم پونہ میں زیر تعلیم ہے۔

دوسرا کام یہ کیا کہ سعودی عرب میں اردو ادب کی محفل آرائیوں میں دلچسپی لی۔ اور وہاں اردو داں حلقوں کو یکجا کیا۔ اس کوشش میں لگے رہے کہ وہاں رہنے والے نادانوں کے بچوں کو اردو کی تعلیم کا موقع ضرور ملے۔ انہوں نے جدہ میں رہ کر ہندوستان کو ہمیشہ سربلند کیا۔ ہندوستانی سفارت خانہ کے تحت ادبی تقریبات کے اہتمام میں نمایاں کردار ادا کیا کرتے تھے۔ انڈیا فورم کے

تحت شاندار تقریبات ہوتی ہے جن میں علیم بھائی نمایاں رہا کرتے تھے ان کا تعلق کئی اداروں سے تھا اور دوسرے ادارے بھی علیم بھائی کا بھرپور تعاون پاتے تھے۔

۱۹۹۷ء قونصلیٹ جنرل آف انڈیا (جدہ) کے تحت ہندوستان کی آزادی کے جشن زریں کے موقع پر بین الاقوامی مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا جس کی انعقاد میں علیم بھائی کا اہم رول تھا۔ اس وقت محمد حامد انصاری صاحب سفیرِ ہند برائے سعودی عرب تھے اور افضل امان اللہ صاحب قونصل جنرل تھے۔ جنہوں نے اس موقع پر ایک خوبصورت سونیئر میں اپنے پیغام میں قونصل حج ذکرالرحمٰن صاحب اور علیم صدیقی اور جناب راشد صدیقی کو مشاعرہ کے انعقاد کے لئے مبارک باد دی تھی۔ اس سونیئر کا اداریہ ''اردو کا ایک خادم اور شیدائی'' کی حیثیت سے علیم بھائی نے نہایت جامع اداریہ لکھا تھا۔ ان کی نظم ''اردو'' سمیت مجلّہ میں جو شعری اور نثری مواد پیش کیا گیا ویسے مواد اور اس کی ترتیب صرف علیم بھائی جیسے سلیقہ مند اور اردو کے شیدائی ہی کر سکتے تھے۔

علیم بھائی وفات سے قبل جب لکھنؤ آئے تو بڑے جوش میں تھے۔ وہ ایک ایسا سونیئر تیار کرنے میں مصروف تھے جس میں ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے دوران اردو زبان وادب کے کردار کو نمایاں کرنا تھا۔ مجھ سے کئی وعدے لے کر واپس گئے۔ مجھے آزادی کی تاریخ پر ایک مضمون لکھنے کا حکم ملا تھا۔ یہ حکم بھی ملا کہ اردو شاعروں کے قومی کلام فراہم کروں اور اس سلسلے میں جو بھی ہو سکے کروں۔ انہوں نے اس وقت مجھے لپٹ لیا جب میں نے ان کو ''جواہرات'' کی ایک جلد پیش کی جوان شعراء کے کلام کا مجموعہ تھا جو ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں کانگریس کے ۴۹ ویں اجلاس کے موقع پر اس مشاعرے میں پڑھا تھے جو جواہر لال نہرو کی خواہش پر مسز سروجنی نائیڈو بلبلِ ہند کی کوشش سے کانگریس کے موتی لال نگر میں امین سلونوی صاحب سکریٹری مشاعرہ کمیٹی اور پنڈت آنند نرائن ملا (صدر مجلس استقبالیہ برائے مشاعرہ) کی کوششوں سے ہوا تھا اور صدارت مسز نائیڈو

نے کی تھی۔اصغؔر گونڈوی، جوشؔ ملیح آبادی،احسانؔ دانش،روشؔن صدیقی،جگرمرادآبادی،بیگم زاہدہ،خلیق الزماں، سیمابؔ اکبرآبادی، بسملؔ الہ آبادی،وصلؔ بلگرامی،حکیم اشرف لکھنوَ،شوکت تھانوی، ساغرنظامی جیسے سرکردہ شعراء نے شرکت کی تھی اورمشاعرہ کمیٹی کے سکریٹری امین سلونوی صاحب کی اس شرط پرشرکت کی تھی کہ ایک قومی نظم ضرور پڑھی جائے۔جواہرات کا دوسراایڈیشن ڈاکٹرسمپورنانند کی خواہش اور مالی تعاون پرامین صاحب نے ۱۹۶۰ء میں پھرشائع کیا تھا۔جواہرات کودیکھ کرعلیم بھائی نے کہا''اماں یارتم نے تومشکل آسان کردی''۔

علیم بھائی ایک انتہائی کڑھے ہوئے شخص تھے۔انگونثری اورشعری ادب پرکمال حاصل تھا۔سعودی عرب میں انہوں نے علامہ اقبالؔ اردواور ماہ صیام کے موضوع پرجوریڈیوانٹرویودیئے تھے وہ آج بھی یادکئے جاتے ہیں۔

علیم بھائی جولکھنوَ میں عربی کی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش پوری نہ کرسکے تھے ارض مقدسہ پرپہنچنے کے بعدفرفرعربی بولنے لگے تھےاورعربی اوراردودونوں کی تعلیم بہت اہم سمجھتے تھے۔

علیم بھائی کاایک وصف یہ بھی تھا کہ وہ مہمانوں کی بڑی پذیرائی کرتے تھے۔ہندوستان سے جدہ جانے والوں میں شاعروں اورادیبوں کی مہمان نوازی دل کھول کرتے تھے۔اورحج کے موقع پروہ جدہ پہنچنے والے عازمین حج کی خدمت مذہبی فریضہ سے کم نہ سمجھتے تھے۔یقیناًان کے یہی اوصاف حسنہ تھے جواللہ نے ان کی موت کوقابلِ رشک بنادیاورنہ کم ہی لوگوں کے نصیب میں یہ ہوتا ہے کہ وفات پانے پرمکہ مکرمہ مقبرۃ العدل میں جگہ پائیں جہاں بن جانے والی قبریں ہمیشہ قائم رہتی ہیں اوریہ بھی دیکھئے کہ ایک ایسے موقع پروفات پائی جب مکہ میں گاڑیوں کاداخلہ بندکردیاجاتا تھالیکن ۸ذی الحجہ کوانکے جسدِ خاکی کعبہ اللہ کے حطیم میں ۳ گھنٹے رکھادیااورلاکھوں نے نمازِ جنازہ پڑھی۔یہ واقعہ بارگاہِ الٰہی میں علیم احمد صدیقی کے درجات کااظہارکرنے کے لئے کافی ہے۔

خراجِ عقیدت

جناب جی ایم احمد خوامخواہ صاحب

(اردو شاعری کے مشہور مزاحیہ شاعر جی ایم احمد خوامخواہ صاحب نے نہ جانے کتنے لوگوں کو اپنے پر لطف اور دلچسپ کلام سے ہسایا ہوگا۔ لیکن والد صاحب مرحوم کے انتقال پر انکو بیحد رنج و ملال تھا۔ گو انکی پہلی ملاقات ۱۹۹۷ء میں ہوئی جب ہندوستان قونصلیٹ (جدہ) نے فیصلہ کیا کہ جشنِ زریں آزادیٔ ہند کے موقعہ پر مشاعرہ کا انعقاد کیا جائے۔ چنانچہ اسے ظاہر ہوتا ہے کہ ان حضرات کی دوستی مختصر لیکن گہری تھی)

ٹوٹ جاتی اور اپنے آپ کو پھٹکارتی
موت گر پنجہ لڑاتی اُن سے بے شک ہارتی
زندگی نے ہی انہیں چھوڑا اچانک خوامخواہ
موت کی کیا موت آئی تھی انہیں جو مارتی

کچھ ایسے مراحل سے ہم سب گزر آئے ہیں
جن میں کئی یادوں کے جذبات در آئے ہیں
ورثا کو دلاسہ بھی دینے کی جو کوشش کی
الفاظ کے آنکھوں میں آنسو اتر آئے ہیں

اک ایسے مصلحِ دیں تھے علیم صدیقی
محبتوں کے امیں تھے علیم صدیقی
بلند و پست کا کچھ فرق ہی نہ تھا جن میں
جدید ہوتے تو ممکن تھا فاصلے رکھتے

اپنے ہاتھوں ہی بگڑنے کے لیے ہوتی ہے
دل کی بستی تو اجڑنے کے لیے ہوتی ہے
ان سے ملنے کی خوشی میں یہ بھلا بیٹھا تھا
ہر ملاقات بچھڑنے کے لیے ہوتی ہے

میری قسمت میں لکھا ظلم و ستم کتنا ہے
یہ میں جانوں تو بتاؤں مجھے غم کتنا ہے
وہ ہمیشہ کے لیے روٹھ کے جاتے جاتے
میرا دامن بھی ذرا دیکھنے نم کتنا ہے

بتائیں کونسی اردو ادب کی محفل میں
ہمارے ساتھ نہیں علیم صدیقی؟
وہ آسمان و زمیں تھے علیم صدیقی
قدیم بھی تو نہیں تھے علیم صدیقی

وہ حسنِ صورت و سیرت میں تادم آخر بہت جمیل و حسیں تھے علیم صدیقی
قیام ہو کہ رکوع میں ہوں یا ہوں سجدے میں نیاز مند جبیں تھے علیم صدیقی
وہ روز مرتے تھے اردو پہ روز جیتے تھے جہاں گئی وہ وہیں تھے علیم صدیقی
نظر سے اپنی وسیع النظر رہے بے شک ذہن سے بھی تو ذہین تھے علیم صدیقی
خودی بلند تھی اتنی کہ رشک آتا تھا عجیب خاک نشیں تھے علیم صدیقی
نمود و نام نہ شہرت کی انکو خواہش تھی خودیٔ میں گوشہ نشیں تھے علیم صدیقی
ملی نہ ہم کو سعادتِ مزاج پرسی کی علیل بھی تو نہیں تھے علیم صدیقی
یقین آئے بھی تو کیسے کہ ہو گئے مرحوم ابھی ابھی تو یہیں تھے علیم صدیقی
عزائم اور ارادے بھی اتنے پختہ تھے یقین کا بھی یقیں تھے علیم صدیقی
رہینگے سب کے دلوں میں وہ دھڑکنیں بنکر یقیں سے بھی قریں تھے علیم صدیقی
میں کیسے ان کو بھلا دوں کہ خوامخواہ میرے دلِ حزیں میں مکیں تھے علیم صدیقی

جدہ ۱/مارچ ۲۰۰۲ء

جناب علیم صدیقی کی وفات پر

جناب محسنؔ علوی صاحب (جدہ)

یارو ہوا ہے ایک سخنور جدا لکھوں
ایک شاعر و ادیب کا نوحہ میں کیا لکھوں

اس حادثہ وقت کو رب کی رضا لکھوں
کیا شان دیکھیے کہ ہوئی ہے عطا لکھوں

رحمت سے جسم ان کا ہوا سرفراز ہے
کعبہ میں حاجیوں نے پڑھی جب نماز ہے

یوں تو یہاں پہ کتنے ہی ہونگے مقیم بھائی
اب ہم سے ہو گئے ہیں جدا وہ علیم بھائی

خود وقت نے کہا تھے وہ کتنے عظیم بھائی
رکھتے تھے اپنے جسم میں قلب سلیم بھائی

اک رنگ مختلف تھا جدا ہی مزاج تھا
کتنے دلوں پہ ان کی محبت کا راج تھا

شاعر ادب ادیب یہاں کھنچ کے آ گئے
کتنے ہی خوش نصیب یہاں کھنچکے آ گئے

جو تھے قریب اردو زباں کھنچ کے آ گئے
ہم سے بھی کچھ غریب جواں کھنچ کے آ گئے

انداز التفات وہ دل میں بسا دیا
الفت سے اپنی قلب اپنا مزا دیا

مسرور ہوں گے خلد میں جا دیکھ دیکھ کر
جنت میں رحمتوں کی فضا دیکھ دیکھ کر

منفرد پہ عطا دیکھ دیکھ کر
لئے وہ رحم خدادیکھ. دیکھ کر

روئیں نہ ان کی موت پہ دل میں خیال ہے
ان کی روانگی تو فقید المثال ہے

یارب لواحقین کو صبر و سکون دے
اولاد کو جہاں میں وہ علم و فنون دے

محبتوں کا الگ اک جنون دے
تیری عبادتوں کو جو تڑپے وہ خون دے

محسنؔ دعا ہے ان سے بھی کچھ سربلند ہوں
بچوں کے دل بھی ان کی طرح دردمند ہوں

علیم بھائی

از: جناب حبیب احمد صدیقی صاحب (جدہ)

وہ اجدادِ شرف کی نیک طینت کا نمونہ تھے
اودھ کی لُٹرئی رسم و روایت کا نمونہ تھے
آپ اُن جیسا کہاں سے لائیں گے ہم اپنی محفل میں
عظیم وضعدار اگلی شرافت کا نمونہ تھے

آہ علیم صدیقی

جناب نوید افروز صاحب (جدہ)

(والد صاحب مرحوم کی وفات کے بعد متعدد تنظیموں نے تعزیتی جلسوں کا انعقاد کیا۔ اسمیں ہندوستان کی مختلف صوبے اور ریاستوں سے تعلق رکھنے والوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اس قسم کے دلی احساسات کا اظہار ہندوستان میں بھی نادر و شادر ہے چہ جائیکہ یہ سعودی عرب میں ظاہر ہوئے۔ اسی سلسلہ میں بزم طلبائے قدیم و محبان جامعہ نظامیہ (جدہ) نے بھی شاداب ہوٹل میں تعزیتی جلسے میں مجلسین کو مدعو کیا اور جناب نوید افروز نوید نے بزم کے ممبران کی طرف سے اپنے احساسات کا اظہار اس منظوم کلام کے ذریعہ پیش کیا)

ایک ہمدرد گیا مونس و غم خوار گیا　　　ہے یہ افسوس کہ ہم میں سے وضعدار گیا
قافلہ آج پریشاں ہے کہ سالار گیا　　　انجمن سر بہ گریباں ہے کہ سردار گیا

دل کو صدمہ ہے بہت ایک ملنسار گیا
نیک اوصاف گیا صاحب کردار گیا

ذکر محبوب خدا خوب کیا کرتے تھے　　　نعت لکھتے تھے کبھی نعت پڑھا کرتے تھے
نعتیہ محفلوں کے جج بھی ہوا کرتے تھے　　　بزمِ طلبائے جامعہ کے طرفدار گیا

دل کو صدمہ ہے بہت ایک ملنسار گیا
نیک اوصاف گیا صاحب کردار گیا

بات آجائے سمجھ میں تو سر ہلاتے تھے　　　غمِ اغیار سن کر وہ تلملاتے تھے
پاک اور ہند کے ہر فرد کو وہ بھاتے تھے　　　ہر زباں پر یہی اپنا جاں نثار گیا

دل کو صدمہ ہے بہت ایک ملنسار گیا
نیک اوصاف گیا صاحبِ کردار گیا

جذبۂ انتقام تھا نہ کبھی بھی دل میں　　صاف کہنے کی تھی عادت کسی بھی محفل میں
فرق کرتے تھے ستاروں میں ماہِ کامل میں　　حیف جدہ سے نہایت ہی سمجھدار گیا

دل کو صدمہ ہے بہت ایک ملنسار گیا
نیک اوصاف گیا صاحبِ کردار گیا

اے نوید انکی اداؤں میں بے نیازی تھی　　زندگی عیش کی تھی اور نہ بہت سادی تھی
یہ حقیقت ہے کہ فطرت میں خوش مزاجی تھی　　بزمِ احباب کو وہ کر کے سوگوار گیا

دل کو صدمہ ہے بہت ایک ملنسار گیا
نیک اوصاف گیا صاحبِ کردار گیا

مصطفیٰ منزل سے بارہ بنکی تک

محترمہ زیبا علوی صاحبہ (کراچی)

ایک بڑا سا گھر، ایک بڑا سا گھرانہ، جس کے بے شمار کمرے، تین یا چار حصے، شہ نشینیں (یا صینچیاں) بڑے بڑے دروالے دالان، آنگن، چھوٹے بڑے باورچی خانے جن میں کہیں سل پہ ہلدی مرچ لہسن پیستی ہوئی مائیں، کہیں کسی گورے چٹے بچے کو کھانا کھلاتی ہوئی انائیں بوا، کہیں اچھی می، کہیں خالہ اپی، کہیں چھوٹی خالہ۔ چاروں طرف ابلتے ہوئے قہقہے، ہنسی مذاق، محبتیں مظبوط رشتے یہ تھا وہ گھر یعنی ''مصطفیٰ منزل'' جہاں علیم بھائی نے آنکھ کھولی تھی۔

اگر بہت پیچھے چلے جائے تو اس وقت کی یادیں گو بہت دھندلی ہیں مگر وہ ساری تصویریں ایک ایک کر کے ذہن میں ابھرتی ہیں۔ جب ہم بھائی بہن اپنے والد کی انگلی پکڑ کے اپنے رشتہ داروں کے گھر جایا کرتے تھے۔ ان چند گھرانوں میں مصطفیٰ منزل بھی تھی۔ قرابت داری تو تھی ہی لیکن ہمارے اس پورے گھرانے سے اور خاص طور سے عظیم بھائی اور رابعہ باجی جو ابو کو چچا کہتے تھے آپس میں بہت محبتیں تھیں۔ اسی زمانے میں عظیم بھائی کے گھر میں ایک بہت بڑی محفل میلاد کا اہتمام ہوتا تھا۔ جس میں سب سے زیادہ پُرکشش اور یاد رہنے والی وہ کھیر ہوتی تھی جو کورے کورے بڑے بڑے سکوروں میں جمائی جاتی تھیں۔ ہمارا اور ہم سے بڑے بھائی ضیاء کا سارا دل اس آخری مرحلے پر لگا رہتا تھا۔ جب کھیر تقسیم ہوتی تھی اور ایک مرتبہ اپنے کسی بڑے کو چکمہ دے کر ہم دونوں نے دو دو پیالے حاصل کر لئے تھے اور اس کامیابی پر اس قدر خوش تھے کہ بیان سے باہر (آج اگر ہمارے بچے یہ کریں تو ہم شرم سے پانی پانی ہو جائیں)

اسی محفل میں جانے کی بیتابی کا ایک دلچسپ واقع یاد آتا ہے۔ اس زمانہ میں چوڑی دار

گھٹنے، غرارے اوراوڑھنیاں یہی لباس تھا شریف گھرانوں کی لڑکیوں کا۔ہمیں یاد ہے ہماری بڑی بہن خالدہ باجی بھی تیار ہوئیں علیم بھائی کے یہاں میلاد میں جانے کے لیے۔اتفاقاً لائٹ چلی گئی حالانکہ جب لائٹ جانے کا سلسلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔لائٹ جانے پر فوراً لالٹنیں اور لمبی لمبی چمنیوں والے لیمپ روشن کردیے جاتے تھے۔اچانک باجی کا جمپر چمنی سے ٹکرایا اور اس میں جلنے سے ایک بڑا سوراخ ہو گیا۔امی نے کہا اب کچھ نہیں ہوسکتا تم گھر پر ہی رہو(اس دور میں لڑکیوں کے پاس نہ تو بیشمار کپڑے ہوتے تھے اور نہ کوئی بناؤ سنگھار کا سامان۔بس ایک دو جوڑے دھراؤ کے جاتے تھے جن سے کئی کئی محفلیں نمٹائی جاتی تھیں۔) باجی بیچاری بہت سیدھی سادی بھولی بھالی تھیں رونے لگیں کہ ہمیں لے چلیے اس سوراخ پر ہم ہاتھ رکھے رہیں گے۔آج بھی کبھی ان باتوں کا ذکر ہوتا ہے تو ہنسی آجاتی ہے۔یہ ہوتی تھی اس محفل میں شریک ہونے کی للک۔انہیں دھندلی یادوں میں بڑی بڑی آنکھوں، چوڑی چوڑی بھویں، موٹے موٹے ہونٹوں، سفید کرتے پاجامے میں جس لڑکے کی تصویر ابھرتی ہے وہ علیم بھائی تھے۔

قاضی باغ، فراش خانہ، راجہ بازار، برتنوں والی گلی تکیہ گنج پرانے لکھنؤ کے ان سب محلوں کے درمیان مصطفیٰ منزل جب ایک بڑی حویلی کی شکل میں واقع تھی۔جہاں علیم بھائی کے والد ڈاکٹر محمد عظیم صدیقی، جناب انیس احمد عباسی (ایڈیٹر روزنامہ حقیقت) یعنی ہمارے انیس چچا، فرقت بھائی (فرقت کاکوروی) جیسی اہم شخصیات بستی تھیں۔فرقت بھائی رہتے تو غالباً نہیں تھے لیکن اس گھرانے کا داماد اور سگے ہونے کے ناطے وہاں کی اہم ترین شخصیت تھے۔عظیم بھائی کا شمار لکھنؤ کے بڑے مسلمان ڈاکٹروں میں ہوتا تھا۔علیم بھائی گو چاندی کا چمچہ منہ میں لئے ہوئے نہیں پیدا ہوئے تھے مگر انکے گھرانے کا شمار ذی حیثیت لوگوں میں ہوتا تھا۔اس وقت ریڈیو، ٹیلی فون گاڑی اچھی حیثیت کے لوگوں کے پاس ہی ہوتے تھے۔

ایک ہلکی سی یاد ہے مگر سب سے پہلے ہم لوگ مصطفیٰ منزل کے ایک حصہ میں رہتے تھے ۔ جو علیم بھائی کی رہائش کا غالباً بالائی حصہ تھا۔ جہاں کے دو واقعے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ ایک وہیں سے ہم اپنی گڑیا کو ہسپتال دکھانے کسی اپنی سہیلی کے ساتھ نکل گئے تھے۔ پھر ہم دونوں کھو گئے ۔تھانے پر جما کئے گئے پھر ڈھونڈ کر لائے گئے۔ دوسری بار بیشمار بندر ہمارے کمرے میں آ گئے تھے ہمارے چیخنے چلانے پر علیم بھائی، بھائی جان، ہلال بھائی وغیرہ نے جو کہ چھتوں پر پتنگیں اڑا رہے تھے بندروں کی اس فوج کو درہم برہم کیا۔

۵۵۔۱۹۵۴ء میں غالباً جب ہمارے رشتے کے چچا اسلام الدین (مرحوم) چچا کا گھر واقع پل جھاؤلال جس کے نیچے کے حصہ میں سندھی رفیوجیز کا قبضہ تھا اور اوپری حصہ میں ہم لوگ رہتے تھے۔ وہ فروخت ہوا تو ہم لوگوں کو یعنی ہمارے والد کو چچا جان (مرحوم) حشمت علی صدیقی صاحب جو علیم بھائی کے سگے خالو تھے رکاب گنج میں واقع احاطۂ شوکت علی میں رہنے کی پیش کش کی ۔اس وقت اپنائیت کا جو ماحول تھا اس کا تصور بھی آج عنقہ ہے اور اس طرح سے ہم لوگ احاطے کے دیوان خانے میں رہنے لگے۔ اور علیم بھائی کے گھرانے سے قربتیں اور بڑھیں کیونکہ جن محلوں کا ذکر اوپر ہے وہ تقریباً سبھی چند پتلی گلیوں سے نکل کر چند گلیوں میں داخل ہوئے تو ایک دوسرا محلّہ شروع ہو جاتا ہے۔ احاطے کے بڑے پھاٹک سے نکل کر رکشہ کیا جائے اور بڑی شاہراہوں سے جایا جائے اس کے بجائے وہ شارٹ کٹ جو دیوان خانے سے مصطفیٰ منزل کو جاتا تھا زیادہ آسان تھا۔

اس وقت مصطفیٰ منزل کے تقریباً سبھی نوجوان اور بچے زیرِ تعلیم تھے۔ کچھ انگلش اسکولوں میں کچھ مقامی کالج اسکولوں میں، علیم بھائی کا ذکر ادھورا ہے اگر ہم یہ چند نام نہ لیں یعنی مُجو، اڈو اور ہلال بھائی وغیرہ۔ ان سب کے پاس قہقہوں کے خزانے تھے۔ ہر ایک کا الگ اپنا اپنا انداز تھا۔ جس

محفل میں بیٹھ جائیں وہ چاہے گھریلو ہو یعنی خالاؤں ، ممانیوں ، بھابھیوں کے ساتھ یا دوست احباب ساتھیوں کے ساتھ وہاں نئی نئی شرارتوں ، دلچسپ گفتگو چھیڑ چھاڑ سے ماحول کو گل گلزار بنا دیں۔ جہاں تک ہمیں یاد ہے پھر علیم بھائی کے رویئے میں تبدیلی آئی۔ کیوں؟ اور کیسے؟ اس کے بارے میں ہمیں اتنا علم نہیں۔ علیم بھائی داڑھی رکھے سنجیدہ سنجیدہ سے دکھائی دینے لگے۔ گویا ان تمام لوگوں میں علیم بھائی چھوٹے موٹے مولانا لگنے لگے۔ لیکن یہ فیز شائد بہت تھوڑے عرصہ رہا۔ انھیں دنوں میں ہماری چھوٹی بہن فریدہ اور چچا جان کی بیٹی اسماء کی گڑیا گڈے کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی اور شائد اپنے سراپہ کی وجہ سے گڑیا گڈے کے نکاح کے فرائض علیم بھائی نے انجام دیئے

اسی زمانے میں احاطے کے سب سے بڑے میدان جو کہ دیوان خانے کے عین سامنے تھا کرکٹ کے میچز ہوتے تھے جس میں مصطفیٰ منزل کے سارے لڑکے ہمارے بڑے بھائی یعنی اختر بھائی ، ضیاء (چھوٹی پو دیعنی رفو (رفعت) گولٹو لڑکیوں میں نلّو ، گلّی وغیرہ بہت چھوٹی تھی) وغیرہ یہ سب ہوتے تھے۔ ان کھیلوں میں بزرگ یعنی چچا جان ، ولی چچا وغیرہ بھی دلچسپی لیتے تھے اور ہم سب لڑکیاں پانی اور چائے دینے کے لئے پیش پیش رہتے تھے۔

زمانہ گزرتا رہا خاندان کے زیادہ تر لڑکے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخل ہوئے کچھ پاکستان سدھارے جس میں حلیم بھائی (حلیم احمد صدیقی سابق وزیر) سلیم اور شاید ہلال بھائی کافی پہلے آنے والوں میں ہیں۔ علیم بھائی نے لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ ایس۔ سی کیا اور اسی طرح سے مصطفیٰ منزل کی رونقیں ادھر اُدھر بکھر گئیں

علیم بھائی کو بہت قریب سے جاننے کا موقع اس وقت ملا جب انھوں نے بارہ بنکی میں ہیلتھ ڈپارٹمنٹ جوائن کیا۔ ہم نے رفیع میموریل اسکول مسولی چھوڑ کر اپنا تبادلہ بارہ بنکی کہ ایک میونسپل کارپوریشن کے اسکول میں کرالیا۔ اور اس طرح ہم لوگ سٹی اسٹیشن سے روز بارہ بنکی کا سفر

کرتے اور شام کو واپسی ہوتی ۔ان میں بے شمار ٹیچرز گورمنٹ دفاتر کے افسران جو لکھنؤ سے بارہ بنکی اور بارہ بنکی سے لکھنؤ کا سفر کرتے تھے ان دنوں کہیں کہیں ریلوے کا نظام بہت تسلی بخش نہیں تھا ۔کبھی کبھی چار چار چھے چھے گھنٹے گاڑیاں لیٹ ہوتی تھیں ۔اور اسٹیشن پر وقت گزارنا محال ہوتا تھا۔ تنخواہیں اتنی کم تھیں کہ بس کا سفر لگژری تھا۔علیم بھائی کی شخصیت ایسے ماحول میں وہ رنگ جماتی تھی کہ نہ صرف انکے دوست ساتھیوں کا وقت ہنسی، قہقہوں میں گزرتا تھا بلکہ آس پاس کے اجنبی ہم سفر بھی اس سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔کبھی کبھی تاش کے پتے کھل جاتے پھر چائے، لطیفوں کا سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہتا۔

علیم بھائی کی ایک خاص خوبی تھی کہ کبھی کبھی گہرے مذاق پر وہ خود اتنا سنجیدہ ہوتے تھے کہ ایک پل کے لئے آپ منہ کھولے انہیں دیکھیں اور جس لمحہ مذاق کی گہرائی کا علم ہو تو نہ ختم ہونے والی ہنسی آپ کے پیٹ میں درد کردے۔ایسا ہی ایک واقع یاد آرہا ہے شاید اس دن بھی ٹرین لیٹ تھی۔ویسے تو زیادہ تر ہم سبھی خواتین ٹیچرز لیڈیز کمپارٹمنٹ میں ہی بیٹھنے کی کوشش کرتے تھے لیکن جگہ نہ ملنے پر اور یوں بھی وہاں کے ماحول میں اس طرح کوئی uncomfortable نہیں محسوس کرتا تھا کسی بھی کمپارٹمنٹ میں جہاں ڈیلی پیسنجرز ہوں بیٹھ سکتے تھے سب ایک دوسرے کے لئے اتنی اپنائیت رکھتے تھے چاہے وہ گپتا جی ہوں چاہے سنہا صاحب ہوں چاہے مسٹر شرما ہوں یا شرمیلی گائتری دیوی ہوں ۔۔کچھ ماحول مکدر ہو گیا کیونکہ ویسے بھی واپسی پر اتنی تھکن ہوتی تھی کہ خاموشی ہی رہتی تھی ۔اس بیزاری کے ماحول میں علیم بھائی کی موجودگی ایک نعمت تھی ۔انکے ہاتھ میں ''نوجیون'' (ایک ہندی روزنامہ) تھا جسے وہ بڑے انہماک سے پڑھ رہے تھے۔پھر اچانک ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہنے لگے ''رام رام سوارت کرلیا'' پہلے تو ہم لوگوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا پھر اخبار پر نظر پڑھی تو خبر تھی ''ان تم سنسکار'' (آخری رسومات) کے لئے ہردوار جاتے ہوئے لاش کی گاڑی

گہری کھائی میں گرنے کے کارن کوئی بھی یاتری زندہ نہیں بچا'' حالانکہ بات موت کی تھی اور ہم لوگوں کے ساتھیوں میں تعداد ہندوؤں کی زیادہ ہوتی تھی لیکن علیم بھائی کی اس برجستگی پر دیر تک قہقہے لگتے رہے۔

ایک دفعہ ملہور یا غالباً جگور کے اسٹیشن پر ریلوے کی ایک بڑی ٹیم نے چیکنگ کے لئے چھاپا مارا۔ بغیر ٹکٹ سفر کرنے والوں کی خاصی تعداد ہوتی تھی۔ ہم لوگوں کے پاس جو ڈیلی پیسنجرز ہوتے تھے۔ایم۔ایس۔ٹی (منتھلی سزن ٹکٹ) ہوا کرتا تھا۔ اتفاق سے ہماری ساتھی گائتری کا پاس ختم ہو گیا تھا وہ بیچاری بہت سیدھی سادی تھی رونے لگی اسکی کسی سے کوئی خاص جان پہچان بھی نہیں تھی۔ ہم تو ویسے بھی پھکڑ ہوا کرتے تھے۔ اسٹیشن سے اسکول تک رکشا کے آٹھ آنے ہوتے تھے اس لئے ایک یا ڈیڑھ روپے ہی ہوتے تھے۔ پر وہ کہنے لگی تم اپنے بھائی سے کہو کچھ کریں اسٹیشن پر پکڑ دھکڑ مچی تھی۔ علیم بھائی سے مدد لی گئی۔ فائن پورے مہینے کے پاس کی جو رقم تھی یعنی بارہ روپیہ پچھتر پیسے وہ چارج کیا گیا۔ علیم بھائی تو ویسے بھی ہر کسی کے کام آنے کے لئے جیسے تیار رہتے تھے۔ انھوں نے گائتری کا فائن ادا کیا۔ اس کے بعد سے صرف تنگ کرنے کے لئے کہتے ''ایں بارہ پچھتر تو دلواؤ ہمارے'' کسی دن گائتری ہمارے ساتھ نہیں ہوتی تھی تو کہتے کہ آج بارہ پچھتر کدھر رہ گئی۔

اسی زمانے میں رابعہ باجی نے امی سے کوئی اچھی خاندانی لڑکی علیم بھائی کے لئے ڈھونڈنے کی فرمائش کی خالہ جان کو بھی ندّو (ناہید) کے لئے کسی خاندانی رشتی کی تلاش تھی۔ ناہید کو دکھانے کا پروگرام بنا۔ ہم نے بند بند مخالفت کی۔ اس لئے نہیں کہ علیم بھائی پسند نہ ہوں اور نہ اس لئے کہ اتنی قلیل تنخواہ تھی کہ مخالفت کے پیچھے ایک خوف تھا اور وہ یہ کہ جس خاندان میں چاند چہرے ستارہ آنکھیں بیاہی ان بیاہی لڑکیاں سبھی حسین مرد حضرات ہوں یا خواتین ایک سے بڑھ کر ایک۔

پہلے ایک کھیپ حسین لڑکیوں کی ڈھل ڈھل کر پاکستان آتی رہی۔ بقیہ بھی گوری گوری کلائیوں اور مخروطی انگلیوں والی لڑکیاں جہاں موجود ہوں خاص طور سے انیس چچا کی سبھی بیٹیاں۔ جہاں چاروں طرف حسن بکھرا ہوا ہو وہاں ایک معمولی شکل وصورت کی لڑکی جائے تو ایک انجانہ خوف رہتا ہے۔مگر سیرت بھاری پڑھی ناہید کی پروقار خاموش شخصیت نے سب کا دل جیت لیا۔ سسرال والوں سے بہت محبت ملی اور علیم بھائی کے لئے انکی بیوی کسی حور پری سے کم نہیں تھی۔

شادی فرنگی محل سے ہوئی تھی جوان دنوں خاندانوں کا خاص دستور تھا بڑے اہتمام سے کی جاتی تھی۔علیم بھائی کو دلہن کے ساتھ جو کمرا دیا گیا اس کی ایک تاریخی حیثیت ہے۔ وہ کمرا اتنا چھوٹا ہے کہ اسے کوٹھری کہا جاتا ہے اور وہ بھی گاندھی جی کی کوٹھری۔محل سرا میں اس کوٹھری میں گاندھی جی کو انگریزوں سے چھپا کر پناہ دی گئی تھی۔ ہم اور ہماری ماموں زاد بہن صوفیہ باجی جو کبھی بڑی شوخ چنچل اور حاضر جواب ہوا کرتی تھیں علیم بھائی کو چھیڑتے رہے دیکھئے کہیں رات میں گاندھی جی کی آتما آکر آپ کو ڈسٹرب نہ کرے کہیں یہ نہ کہے بچو! کانگریس میں شامل ہو جاؤ ورنہ۔۔۔۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔صبح سے ہی علیم بھائی کے لئے اشعار کی پرچیاں ’’اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی۔‘‘ اور چھیڑ چھاڑ کے جملے چلتے رہے لیکن علیم بھائی سے جیتنے کا کیا سوال۔

کچھ دنوں کے بعد علیم بھائی دہلی سیٹل ہو گئے۔ پھر ان کے لکھنوء آنے کا انتظار رہتا۔کبھی اطلاع کر کے تو آتے نہیں تھے۔ جاڑوں کی راتیں گیارہ بارہ بجے کا وقت دروازے پر دستک ہوئی سارے لوگ اٹھ گئے کون پوچھنے پر آواز آئی پوسٹ میں دھڑکتے دل سے دروازہ کی طرف سب لوگ بڑھنے لگے شاید کوئی ٹیلی گرام ہو، خدا خیر کرے، دروازہ کھلا تو ناہید اور علیم بھائی اپنے مخصوص انداز میں کھڑے ہیں پھر کہاں کی نیند، کس کا سونا، نئے نئے لطیفے، چھیڑ چھاڑ، کیسے وقت گذر جاتا تھا اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ کافی سنجیدہ باتیں ہوئی تھیں ہم ان سے انکی سروس کے متعلق اور دوسری باتوں کے بارے میں بات کرر ہے تھے۔ پھر ہم نے ان سے پوچھا وہاں آپ کی رہائش کہاں ہے؟ منہ سے بند بند آواز نکلی۔قبر میں، ہم سوچنے لگے کہ شاید ہمارے کانوں کو دھوکہ ہوا ہے یا علیم بھائی ہماری بات سن نہیں سکے ہیں۔ ہم نے اپنی بات پھر دہرائی کہنے لگے ہاں ہاں وہیں۔ معلوم یہ ہوا کہ علیم بھائی پرانی دلی میں جس محلے میں رہتے تھے اس کا نام ''چتلی قبر'' تھا۔ چتلی وہ منہ ہی منہ میں کھا جاتے تھے۔ پس منظر یہ تھا کہ چتلی کسی کی بہت چہیتی بکری تھی جس کے مرنے کے بعد اس کے مالک نے اس کی قبر بنائی اور پھر وہ جگہ اس نام سے مشہور ہوگئی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب علیم بھائی تھوڑے دنوں کے لئے پونہ گئے تھے۔ اتفاق سے ہمارا چھوٹا بھائی ریاض (مرحوم) بھی وہیں تھا۔ وہ بتاتا ہے کہ علیم بھائی جدھر سے گزرتے پھلجڑیاں چھوڑتے جاتے تھے۔ بقول کسی شاعر کے اس کا محبوب ''ستم ایجاد'' ہے علیم بھائی ''مذاق ایجاد'' تھے۔ سنا ہے کسی ریستوران میں گئے بڑی سنجیدگی سے مینو دیکھتے رہے پھر ویٹر کو اشارہ کیا وہ آیا تو سب کی طرف نظر دوڑا کر کہنے لگے ''چار گرم کُتے لے آؤ'' وہ گڑ بڑا گیا اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ صاحب کیا بول رہے ہیں وہ منہ دیکھنے لگا۔ پھر مینیو دکھا کے کہنے لگے بھئی یہ ڈش یعنی ''ہاٹ ڈاگ'' اور ہاں تین مردانی اور دو زنانی چائے بھی۔ ریاض بتاتا ہے آس پاس جتنے لوگ بیٹھے تھے ان سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔

علیم بھائی کی یہ بھی خوبی تھی کہ وہ مذاق بھی ماحول اور لوگوں کی ذہنی سطح کے پیش نظر کرتے تھے۔ اردو فارسی کے چوٹی کے اشعار علیم بھائی کی زبان پر رہتے تھے گو کہ علیم بھائی لکھنو یونیورسٹی کے سائنس کے طالب علم تھے مگر اقبال، غالب، میر اور اردو ادب کا شاید کوئی گوشہ ایسا جس پر آپ کی نظر نہ ہو۔ نیر بھائی (یعنی ڈاکٹر نیر مسعود جنکی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں) کا ذکر بڑے احترام

سے کرتے تھے، ان محفلوں کو کبھی دیکھا نہیں گیا مگر علیم بھائی کا علمی ذوق سنا ہے ایسی مجلسوں میں بھی اپنا الگ انداز رکھتا تھا۔

شاید دوسروں کو بھی اس کا اندازہ ہو لیکن اتنے پہلوؤں کے ہوتے ہوئے ان کی شخصیت کا سب سے متاثر پہلو ان کی دینداری تھی اور وہ بھی ہمیشہ سے لیکن آخری عمر میں اس میں اور شدت آ گئی تھی۔ ان کی قناعت پسندی، اقربا پروری، بند مٹھی لوگوں کے ساتھ سلوک کا اندازہ ہم سے زیادہ کس کو ہوگا۔ ایک زمانے میں سنا تھا کہ علیم بھائی دلی یا پونہ میں کہیں گھر بنانے کی سوچ رہے ہیں (جہاں تک ہمارے علم میں ہے) ہم نے پوچھا تو کہنے لگے کوشش کر رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کوشش سے کیا مراد ہے؟ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے ہم نے پھر پوچھا کہنے لگے ''وہاں'' بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

سنا ہے وہ آسودہ حالی جو جدہ کے شروع کے قیام میں تھی وہ نہ رہی۔ لیکن علیم بھائی کی خوددار طبیعت، سیر چشمی اور قناعت پسندی نے کبھی کسی کا احسان قبول نہیں کیا۔ زندگی کی شروعات میں ہی اگر وہ چاہتے تھے تو اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح پاکستان آ کر دولت کے انبار لگا لیتے لیکن ان کا اپنا ایک نظریہ اور اصول تھا جو آخری وقت تک قائم رہا۔ سنا ہے اپنی صحت کی طرف سے بھی بہت لاپرواہ تھے۔ جو برجستگی ان کے مذاق اور انکی ذات میں تھی اسی کو برقرار رکھتے ہوئے موت کو بھی اچانک لبیک کہا۔ تمام عمر اپنی ذات سے ہنسانے والے علیم بھائی سب کو رلا کر چلے گئے ۔موت کی حقیقت کو دوسروں کو تسلیم کرانے والے علیم بھائی نے اس حقیقت کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ۔زندگیوں پر رشک کرنا تو عام ہے ایسی موت پر بھی رشک آتا ہے جو انکے حصہ میں آئی۔ گھر بنایا بھی تو کہاں (سبحان اللہ)۔ اب ان سے وابستہ تمام لوگوں کے دلوں میں ان کی یادیں ہمیشہ رہیں گی۔

علیم احمد صدیقی: کچھ یادیں (بچپن سے شادی تک)

ڈاکٹر محمد عبدالحفیظ صدیقی صاحب (پونہ)

عزیزی یوسف سلمہ کی فرمائش پر اپنے پھوپھی زاد بھائی (اور ۱۹۶۹ء سے ہم زلف بھی) علیم احمد صدیقی مرحوم کے بارے میں ''کچھ'' لکھنے بیٹھتا ہوں تو یادیں چشمِ تصور کے سامنے جمع ہوتی جارہی ہیں۔ سب کچھ بیان کرنا تو مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن جو یاد سامنے آتی جارہی ہے بلا تقدیم و تاخیر کے لکھنا شروع کرتا ہوں۔ لکھنؤ میں بچپن سے جن قریب ترین اعزا کے گھروں میں آمد و رفت تھی ان میں قدیم لکھنؤ کے فراش خانہ (جو بعد میں مصطفیٰ منزل سے جانا گیا) کو خصوصیت حاصل رہی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کوٹھی میں متعدد اعزا مختلف عمر والے یکجا رہتے تھے۔ والد صاحب مرحوم سب سے پہلے اپنی ممانی صاحبہ (بیگم مصطفیٰ احمد صاحب) جو اس کوٹھی میں سب سے زیادہ بزرگ تھیں ان سے جا کر ملتے تھے۔ اور میں انھیں تسلیم عرض کرنے کے بعد اپنے ہم عمروں کو تلاش کرتا تھا۔ علیم مجھ سے تقریباً پانچ سال چھوٹے تھے۔ وہ کافی ذہین اور چلبلے تھے۔ انکے چھوٹے بھائی حلیم احمد مقابلتاً سنجیدہ اور خاموش مزاج تھے۔ دونوں سے ملکر خاصا دلچسپ وقت گزرتا تھا۔ عید اور بقرعید کے موقع پر یہ دونوں بھائی اپنے دوسرے خالہ زاد بھائی مجیب سلمہ وغیرہ کیساتھ دوگاواں میں ہم لوگوں کے گھر عید کا سلام کرنے ضرور آتے تھے۔ والد صاحب کے ساتھ دوسرے دن میں بھی انکے گھر ضرور جاتا تھا۔ والد صاحب ان گھروں میں جہاں بچے ہوتے تھے سنتِ رسول اللہ کی پیروی میں کچھ نہ کچھ مٹھائی یا پھل لیکر ضرور جاتے تھے اور انکا خیر مقدم بچے بھی بڑے جوش سے کرتے تھے۔ والد صاحب کی محبت و خلوص کی قدر بزرگ و جواں سب یکساں طور پر کرتے تھے۔ آج سے تقریباً بارہ برس پہلے جب میری چھوٹی بہن طاہرہ مرحومہ اپنے دیور ڈاکٹر فضیل فاروقی کی

بیٹی کی شادی میں شرکت کرنے ممبئی سے کراچی گئی تھیں تو وہاں فراش خانہ والے اعزانے بڑی گرم جوشی اور محبت کا مظاہرہ کیا اور متعدد بہنوں نے جواب ماشاءاللہ نانی اور دادی بن گئی ہیں ۔فراش خانہ کی بچپن کی یادوں میں اپنے لطیف ماموں کی محبت اور انکے ضیافت کے انداز کا تذکرہ ضرور کیا۔

علیم بچپن ہی سے لکھنوی ادب وتہذیب کے علمبر دار رہے۔ بزرگوں کا ادب کرنا، سلام کرنے میں پہل کرنا، اور گفتگو میں مہذب الفاظ استعمال کرنا ان کی خصوصیت تا دمِ آخر قائم رہی۔انتہاء یہ تھی کہ بال بچوں والے ہوجانیکے بعد بھی میرے سامنے کبھی سگریٹ نہیں پیتے تھے۔حالانکہ میں ان سے محض پانچ سال بڑا تھا۔

۱۹۶۸ء میں میرا تقرر نیشیل ڈیفینس اکیڈمی (این ڈی اے) کھڑکواسلہ (نزد پونہ) میں بحیثیت لکچر رشعبہ جغرافیہ ہوگیا۔پونے شہر میں اہلیہ کی سگی پھوپھی کے گھر آنا جانا رہتا تھا۔ان کی بڑی بیٹی ناہید میری اہلیہ کو بہت عزیز تھیں اور میں بھی ان کی شخصیت سے متاثر تھا۔ان کی سنجیدگی ،متانت،خوش اخلاقی اور پابندی صوم وصلوۃ ہونیکی خوبیاں بیحد قابلِ تعریف نظر آئیں۔جب لکھنؤ گیا تو رابعہ پھوپھی (علیم کی والدہ) نے مجھے اپنے گھر بلایا اور کہا ’’تم میرے عزیز ہو اور ظاہر ہے تم اپنی سالی ناہید کو بھی خوب جانتے ہو اس لئے میں تمہاری رائے کو زیادہ اہمیت دونگی۔تم بتاؤ کہ علیم کے ساتھ ناہید کا رشتہ کیسا رہے گا‘‘۔میں نے بلا تامل اپنے مندرجہ بالا تاثرات کا اظہار کیا اور کہا کہ انشاءاللہ یہ رشتہ بہت کامیاب رہے گا۔کیونکہ میں دونوں کے مزاج سے واقف ہوں۔اور انہیں یہ بھی بتایا کہ ناہید کی والدہ زکیہ پھوپھی بھی غیر معمولی خوبیوں کی مالک ہے۔اور مذہب کی پابندی کے ساتھ امور خانہ داری میں ماہر ہیں۔خصوصاً کھانا پکانے اور اسے سجانے میں تو بڑے ماہر باورچی مات ہوجائیں گے۔اس کا مشاہدہ مجھے اپنے سسرال کولار گولڈ فیلڈ (کے جی ایف) میسور میں ہوا جہاں ان کے بھائی اقبال احمد رزاقی صاحب (یعنی میرے خسر) اسپیشل سپرنٹنڈٹ پولیس

کے عہدہ پر فائز تھے اور کھانا کھانے اور کھلانے کے بڑے شوقین تھے۔عموماً زکیہ پھوپھی اپنے بچوں کے ساتھ گرمیوں کی تعطیل میں وہاں آتی تھیں اور میری خوشدامن صاحبہ کیساتھ مل کے دونوں خوب پکوان پکاتی تھیں۔دونوں نند بھاوج میں دوستی بھی بہت تھی۔اس لئے مجھے یقین ہے اس ٹریننگ سے ناہید نے ضرور فائدہ حاصل کیا ہوگا۔ رابعہ پھوپھی نے کہا''اب مجھے اطمینان ہوگیا۔خاندان وغیرہ تو معلوم ہے،ہی لڑکی کے ذاتی گُنوں سے واقفیت نہیں تھی''۔ مجھے افسوس رہا کہ نومبر ۱۹۶۹ء میں علیم وناہید کی شادی میں شرکت کرنے لکھنؤ نہ جاسکا مگر غائبانہ طور پر شریک رہا۔

سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

علیم جب بھی پونہ آتے تھے تو کھڑکواسلہ جو ۲۵ کیلومیٹر دور ہے ہم سب سے ملنے ضرور آتے تھے۔اور چونکہ وہ خود بھی اچھا کھانے کا ذوق رکھتے تھے تو گھر میں خصوصاً باورچی خانہ میں خوب گرم جوشی رہتی تھی۔

عام طور سے خوش قسمتی کے معیار کے دو امور مانے جاتے ہیں۔اچھی ملازمت ملنا اور اچھی شریک حیات ملنا۔دیر سویر تو بہت سے معاملات میں ہوتی رہتی ہے لیکن بہر حال علیم صدیقی خوش قسمت رہے کہ اچھی شریکِ حیات ملی جس نے ان کی زندگی کے ہر زیر وبم میں ساتھ دیا اور اللہ کے فضل سے معاشی حالات بھی سدھرتے چلے گئے۔مزید یہ کہ اولاد ماشاء اللہ فرمانبردار اور سعادت مند و ہنر مند نصیب ہوئی اور زندگی کا اختتام جوارِ رحمت میں جس کو حاصل ہو جائے تو پھر

ع وہ کیوں نہ خوبی قسمت پہ اپنی ناز کرے

ایک ساتھی ایک دوست اور ہم سفر

محترمہ ناہید صدیقی صاحبہ (بیگم علیم احمد صدیقی)

عنوان سے آپ توقع کرینگے کہ شاید تین اشخاص کے سلسلے میں کچھ عرض کرنے جارہی ہوں، لیکن یہ ایک ہی شخص علیم احمد صدیقی کے سلسلہ میں جنکا ساتھ بذریعہ مناکحت ۵ نومبر ۱۹۶۹ء کو شروع ہوا اور ۳۳ سال کا عرصہ اس ہم سفر کے ساتھ ایک اچھے دوست کی طرح گزرا۔

۵ نومبر ۱۹۶۹ء سے قبل ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں تھا گو کہ کچھ اعزاء ہمارے ایک تھے، اس سے قبل میں اپنے والدین جناب انوار اللہ صدیقی اور والدہ ذکیہ خاتون اور اپنے بھائی رفیع اللہ صدیقی اور بہن نسرین کے ساتھ پونہ میں قیام تھا۔ جہاں پر اپنی پڑھائی ختم کرنے کے بعد میں ایک سرکاری محکمہ سے منسلک تھی اور پھر میرے سفر کا اغاز ہوا جو کہ لکھنؤ میں شروع ہوا اور پھر ۱۹ر فروری ۲۰۰۲ء کو جدہ میں ختم ہوا۔

اس طویل عرصہ میں ہماری زندگی بہت سارے تجربات اور اتار چڑھاؤ سے گزری۔ اکثر و بیشتر بڑے تلخ اور صبر آزما امتحانات سے بھی۔ جس نے سب بہت کچھ سیکھا اور حاصل کیا۔ سعودی عرب آنے سے قبل ایک سرکاری محکمہ اور پھر بومبائے ڈائنگ Bombay Dyeing جیسی نامور کمپنی سے منسلک رہے اس دوران آپ کا ایک بہت ہی عزیز دوست اور بھائی رفعت علی کا ساتھ رہا جنہوں نے آپ کی مستقبل کی راہیں اختیار کرنے میں کافی مدد کی۔ اور بقول انکے میں نے بہت سی اچھی باتیں اپنی ملازمت کے سلسے میں اپنے بھائی رفعت سے سیکھیں۔

گو کہ وہ اپنی والدہ (رابعہ خاتون) سے بہت انس رکھتے تھے اس سرزمین کی محبت میں اور روزگار کے سلسلے میں ۱۹۷۸ء میں آگئے۔ یہاں پر کچھ عرصہ کے بعد ایک کمپنی میں بحیثیت کمرشل

مینیجر شامل ہو گئے۔

اللہ کے کرم فرمائی سے کئی بار حج ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اللہ قبول فرمائے۔ اس سرزمین اور یہاں کے لوگوں سے ایک خاص انس ومحبت رکھتے تھے یا یوں کہیئے کہ حسن ظن رکھتے تھے اور شاید یہی حسن ظن کا اثر ہے کہ آخری سفر میں وہ ہر کام پر ساتھ رہا۔ گو کہ خود عربی پر دسترس حاصل نہ کر سکے لیکن یہ خواہش کہ لڑکے عربوں کی طرح عربی بولیں اس خواہش کو عملی جامہ پہنایا جسمیں بچوں نے بھی پوری طرح تعاون دیا اور تینوں بیٹوں نے یہاں کے معروف عربی اسکول روضۃ المعارف سے انٹر کیا اور ماشاء اللہ نمایاں کامیابی بھی حاصل کی۔

ساتھ ساتھ اپنے مطالعہ کے شوق کی وجہ سے عربی زبان میں ماشاء اللہ دسترس حاصل کی اور اپنے والد کی خواہش پوری کی۔

اللہ تعالیٰ نے انکو ایک غیر معمولی حافظہ عطا کیا تھا۔ اشعار کا شمار کرنا مشکل تھا جو انکے یاد تھے۔ یوں تو خیر اشعار بہت لوگوں کو یاد ہوتے ہیں لیکن تقاریر اور مضامین میں ان کا برمحل استعمال ایک مثالی بات تھی۔ شاید اسکی ایک وجہ مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ علیہ سے غیر معمولی عقیدت تھی۔ مولانا صاحب مرحوم کی تحریر کا وسیع مطالعہ انکے اقوال جو انکو دل سے پسند تھے وہ زبانی یاد تھے۔

زبان اردو سے غیر معمولی انس ولگاؤ تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مادری زبان سے اور اپنے دین سے غیر معمولی محبت کا نتیجہ تھا۔ لوگوں سے کبھی بہت التجا سے اور کبھی جوش اور غصہ میں کہتے کہ بچوں کو اردو سیکھاؤ۔ ہمارے دین کا بہت بڑا سرمایہ اردو زبان میں ہے۔ مولانا علی میاں صاحب رحمہ اللہ علیہ کی تصانیف بھی بہت شوق سے پڑھتے تھے اور انکے اچھے جملے دہراتے تھے۔

اردو ادب اور شاعری سے لگاؤ کی ایک مثال اور یہ ہے: شہر جدہ میں جہاں پر روایتی مشاعرہ ہوا کرتے نہ تھے جسمیں ٹکٹ لگائے جاتے تھے اسکا رواج ختم کیا اور وہ بھی ہندوستان

آزادی کی پچاسویں سالگرہ پر۔ ہندوستانی قونصلیٹ اور انڈیا فورم کے زیر اہتمام پہلی بار ایک ایسا مشاعرہ ہوا جس میں بجائے ٹکٹ کے دعوتی کارڈ کے ذریعہ سامعین اور ذائقین ادب کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا۔ تقریباً تین ہزار کا مجمع اردو ادب کے گہواروں سے ہزاروں میل دوری کے فاصلہ پر اس پر لطف مشاعرہ سے لطف اندوز ہوا۔ جن حضرات کو ہال کی تنگی کی وجہ سے اس مشاعرہ سے محرومی کا سامنا کرنا پڑا انھوں نے کیسٹ کے ذریعہ اسمیں نعم البدل پایا۔ اس شاندار مشاعرہ کے تمام اخراجات ایک شاندار مجلّہ کے ذریعہ پورے کیئے گئے تھے۔ جسمیں سعودی عرب کی چیدہ چیدہ اور نامور کمپنی نے مالی تعاون کیا تھا۔ مرحوم کی نظم اردو سے مشاعرہ کا اغاز ہوا تھا جسمیں انکے دلی جذبات اردو زبان کے لیے الفاظ اور تراکیب کے حسن و جمال میں سج کر دیکھائی دیے۔ چنانچہ اس مشاعرہ کی بنیاد اتنی مضبوط رہی کہ ہر سال یہ مشاعرہ اب یومِ آزادی کے موقع پر ہندوستانی قونصلیٹ کرتا ہے۔ امسال کے مشاعرہ سے ۲۰۰۲ء جناب ذکر الرحمٰن صاحب نے مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے مشاعرہ کا آغاز کیا تھا۔

اسکے علاوہ انڈیا فورم اور جدہ سے نشر ہونے والا اردو ریڈیو اور اخبارات کے ذریعہ مرحوم کی اکثر و بیشتر تقاریر، مضامین اور خطوط اردو نیوز میں شائع ہوا کرتے تھے۔ انڈیا فورم کے مقابلوں میں اکثر متعدد دفعہ ہم دونوں کو پہلا انعام ملا۔

قونصلیٹ کے بیشتر عملہ بہت خیال اور عزت سے مرحوم کا احترام کرتا تھا، چنانچہ اسکا ثبوت مرحوم کی یادگار میں دیئے گئے اعزازی تمغہ سے ہوسکتا ہے۔

اسی طرح زندگی کا سفر مختلف نشیب و فراز سے گزرتا رہا آخری بار اپنے بیٹے وقار عظیم سلمہ کی شادی کے سلسلہ میں ہندوستان گئے۔ اس بات کی مزید مسرت و خوشی تھی کہ شادی انکے وطنِ عزیز لکھنؤ سے تھی۔ بہت ذوق و شوق سے مہمانوں کو مدعو کیا۔ وہاں سے واپسی کے بعد صحت زیادہ

ٹھیک نہ رہتی اور علاج بدستور جاری رہا۔لیکن وہ آخری وقت تک چاق وچوبند رہے۔ چنانچہ سفر آخرت سے ایک رات قبل حجاج بیت اللہ کے مبارک سفر کی روانگی پر دیئے گئے ہندوستانی قونصلیٹ کی طرف سے عشائیہ اور پریس کانفرس میں بہت مستعدی اور خوشی سے شریک ہوئے۔ فجر کی نماز قریبی مسجد میں ادا کی۔ کچھ طبیعت ست تھی دوائیں لیں اور آرام کرنا چاہا۔لیکن صحت میں گرواٹ کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا اس کے بعد قے ہوئی۔ مرحوم کی ہمشیرہ کے سسرالی رشتہ دار ڈاکٹر احد عابدی سلمہ کو فون پر مطلع کیا گیا، مرحوم کے ماموں زاد بھائی مدثر احمد بھی آگئے اور ڈاکٹر اشرف (معتمد خاص صوفی اقبال صاحب مدنیؒ) بھی معائنہ کے لیے گھر آگئے۔ انکے مشورے کی بنا پر انکو مرحوم کے خالہ زاد بھائی سید محمد خالد کی گاڑی میں شاہ فہد ہسپتال لے جایا گیا۔ حجاج کے قافلے حج کے مبارک سفر پر روانہ ہو رہے تھے اور مرحوم کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر کے خدائے ذوالجلال کے سامنے پیش ہونے کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اسلامی کیلنڈر کے حساب سے ۸ ذی الحجہ ۱۴۲۲ھ (مطابق ۱۹ر فروری ۲۰۰۲ء) کا دن تھا۔

ہمارے بڑے بیٹے وقار سلمہ اپنے دلہن کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہونے والے تھے لیکن انتقال کی وجہ سے پروگرام فسخ کر دیا۔ ایسے موقع پر جب جدہ سے مکہ مکرمہ کے لیے چھوٹی گاڑیاں بند کر دی جاتی ہیں اور اس ارض مبارکہ میں تدفین ایک ناممکن خواب ہوتا ہے۔لیکن خدا نے جہاں کی مٹی لکھی تھی اس نیاز مند شخص کا جنازہ مکہ مکرمہ پہنچ گیا اور ۸ ذی الحجہ جس دن نمازِ عصر کے موقع پر لاکھوں حجاج بحیثیت ضیوف الرحمٰن طواف ادا کر رہے ہوتے ہیں اس مبارک مجمع نے بعد نمازِ عصر نمازِ جنازہ ادا ہوئی اور مقبرہ العدل میں جگہ پائی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مقبرہ العدل جبل نور کی گود میں واقع ہے مزید اسکے اسمیں شیخ علی طنطاویؒ اور مفتی سعودی عرب شیخ عبدالعزیز بن بازؒ کی بھی قبریں ہیں اور یہاں قبریں بھی شق قبریں ہوتی ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے

طرز پر شاید مرحوم کا سنت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لگاؤ کا نتیجہ ہی تھا۔ فللہ فی خلقہ شؤون ۔ تدفین میں وقار سلمہ مع متعدد اقارب اور اعزہ پیش پیش رہے لیکن مرحوم کے رفیق خاص جناب خالد قدوائی صاحب نے کلیدی رول اور اہم کردار ادا کیا۔

اس مختصر سی زندگی کے سفر کے بعد کچھ روشنی ڈالنی ضروری ہے مرحوم کی شخصیت پر بہ حیثیت ایک انسان کے الگ الگ رشتوں میں۔

بہ حیثیت لڑکے کے اپنے والدین کے فرمانبردار صاحبزادے تھے اور میرے خُسر جناب ڈاکٹر محمد عظیم احمد صدیقیؒ صاحب کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔ گو اپنے والد کی طرح ڈاکٹر بننا چاہتے تھے لیکن نہ بن سکے پھر بھی بی ایس سی کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ اپنی والدہ صاحبہ سے بہت زیادہ محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔

بہ حیثیت بھائی کے اپنے بھائی بہنوں کے لیے بہت شفیق اور فکر مند رہتے تھے انکے عروج سے بہت خوش ہوتے اور ہمیشہ سب کا ذکر بہت نہال ہو کر کرتے۔

بہ حیثیت دوست کے بہت مخلص تھے اور یہی حال اقرباء کے لیے چاہتے تھے کہ انکے کسی کام آسکیں جب کوئی سعودی عرب آتا تو اسکے لیے روزگار کے لیے کوشاں رہتے۔ مختلف جگہوں پر لے کر جاتے بھی۔

دوستوں کے سلسلے میں ان کو رفقاء بھی ہر جگہ بہت اچھے ملتے جو انکی اعانت اور مدد میں ہر وقت کوشاں رہتے۔ چنانچہ بارہ بنکی کے دوران قیام میں حسیب احمد صدیقی، عبدالمجیب صدیقی عرف مُجو، مسٹر بہار گو اور حسین امین صاحب دہلی کے دورانِ قیام میں جناب اوصاف وصفی صاحب، جناب عظیم اختر صاحب، بریگیڈیر ظفر احمد اور بمبئی کے دورانِ قیام میں رفعت علی، جناب حشمت علی اور جدہ کے تیس سالہ دورانِ قیام میں صدیق و اسماعیل بوہیرہ (فرزندانِ صوفی

عبدالرحمٰن صاحبؒ)، مسعود اعظم صاحب، ناظر قدوائی صاحب، عزیز قدوائی صاحب اور نہ جانے کتنے رفقاء تھے جنکے ناموں کا استحضار اور استقصاء کرنا بھی مشکل ہے۔

جدہ کے دوران قیام میں بہار سے تعلق رکھنے والے جناب احمد جمال (بھائی) صادق صاحب نیز مصطفیٰ (بھائی) قدوائی صاحب انکے کرم فرما میں تھے جنکی عنایت اور توجہ کا تذکرہ مرحوم اکثر و بیشتر ہم اہلِ خانہ سے کرتے۔

رفقاء کے اس دائرہ میں زبان، مذہب یا ملک کا سوال نہیں تھا، چنانچہ جنوبی ہند سے تعلق رکھنے والوں کی بڑی تعداد تھی چنانچہ کیرالا والوں کی ایک جمِ غفیر نے حی الشرفیہ میں مرحوم کے لیے نمازِ جنازہ غائبانہ طور پر ادا کی۔ مزید اس کے عرب حضرات سے بھی آپ کے دوستی کے مراسم تھے انمیں قابل الذکر ہیں شیخ باعبود اور انکا پورا خاندان جو مرحوم سے بہت محبت اور خلوص سے ملتا۔

اپنے بزرگوں کو سلام کرنے جاتے عیدین کے مواقع پر خاص طور پر۔ اور دوسرے دن اپنے چھوٹوں کے منتظر رہتے تاکہ وہ بھی سیکھیں۔ اگر کسی کم عمر کی بات خلافِ شرع یا ادب دیکھتے تو ضرور ٹوکتے اور کہتے کہ اگر ہم اپنے چھوٹوں کو نہ سکھائیں گے تو کون کریگا اور کون انکو بُرا بھلا بتلائے گا۔

بہ حیثیت شوہر کہ وہ بہت اچھے اور اسلامی کردار کے حامل شوہر تھے۔ حسن اتفاق سے ہم میں بے حد ہم آہنگی تھی اور اگر اختلاف ہوتا تو بخوبی دوسرے کے مطابق بدلتے۔ اکثر و بیشتر اردو کے کسی خاص لفظ کے تلفظ پر بحث ہوتی لیکن جلد ہی کسی لغت کے سہارے اس بحث کا خاتمہ کرتے۔ لغات کا خزانہ ہمارے گھر میں موجود ہے جسمیں انگریزی، اردو، ہندی اور عربی زبان کی مختلف لغات شامل ہیں۔

کتب بینی کا شوق گھر کے ہر فرد کو ہے۔ وللہ الحمد، چنانچہ تقریباً ہر رات کھانے پر جب اہل خانہ اکھٹے ہوتے تو معلوماتِ عامہ جسمیں سیاست سے لیکر احکامِ دین سب کچھ شامل ہوتے

ہیں اس پر گفتگو کرتے۔ اپنے بچوں کو دینی معلومات اور اسلامی وقائع اور قصوں سے مالا مال کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ اشعار اور لطیفے بھی سناتے۔ لطیفے سنانے کا بھی ایک خاص انداز تھا اسکو ایک نئے سانچے میں ڈال کر سناتے کہ سننے والے بھی محظوظ ہوتے۔ لیکن اس بات کا خیال کرتے کہ کسی کی دل شکنی نہ ہونے پائے۔

اپنی سسرال میں نہایت ہی زندہ دل داماد مشہور تھے وہاں کے بزرگوں کی بہت عزت کرتے اور چھوٹوں سے شفقت کا معاملہ رکھتے۔

کون کون سے باتوں کا ذکر کیا جائے اور کہاں تک۔ بقول مرزا غالب کہ

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں گئیں

اپنے بھائی علیم کی یاد میں

محترمہ سلطانہ صدیقہ صاحبہ (علی گڑھ)

اُس کے جانے سے محل کی رونق گئی
دلکشی گل میں اور نہ وہ خوشبو رہی
ایسا عشق حقیقی کا چھایا نشہ
بادشاہی میں بھی وہ فقیر ہی رہا
گا ہے شعلہ تھا وہ اور شبنم کبھی
اسکی جیسی محبت نہ دیکھی کبھی
محفلوں پہ وہ چھایا تھا کچھ اس طرح
آج بھی یاد اُسکو زمانہ کرے
اسکی فطرت میں طنز و مزاح تھا چھپا
لے کے جسکا سہارا وہ جیتا رہا
شورشِ غم میں بھی مسکراتا رہا
گنگنا کر ہر ایک غم چھپاتا رہا
ایسا صوفی تھا جس کو نہ سمجھا کوئی
راہ چلتوں کی بھی اُس نے کی دلجوئی
میر و غالب و اقبال سعدی کے شعر
یاد تھے کس روانی سے بھولے بغیر

علم کا اک خزانہ تھا اسکا ذہن
لوگ ہوتے تھے خوش جب وہ کھولے دہن
شخصیت اُسکی بھولی نہ جائے کبھی
ایسا لگتا ہے اب بھی یہیں ہے کہیں
زینت میں عالموں کی تھی صحبت نصیب
مر کے بھی ساتھ انکے رہا خوش نصیب
محفلوں کی وہ جان بزم کی روح تھا
سچ ہے پیارا تو دونوں جہاں کا وہ تھا
جب وہ غیروں میں تھا اتنا ہر دلعزیز
کیسے بھولیں گے پھر اُسکے اپنے عزیز

والد صاحب مرحوم چند خصوصیات

جناب احمد وقار عظیم صدیقی صاحب (جدہ)

والد صاحب مرحوم کے بارے میں کچھ تحریر یقیناً ایک صبر آزما تجربہ ہوتا ہے۔ لیکن اس تکلیف و رنج میں کمی کا احساس اس قت ہوتا ہے جب انکی اوصافِ حمیدہ کا احساس و تذکرہ روز بروز بڑھتا ہے چنانچہ اللہ کے قرب و جوار نصیب ہونا انکے لیے یقیناً ایک نعمت ہائے عظمی ہے۔ فللہ الحمد۔

ابا مرحوم ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ جسمیں مختلف جوانب کو اجاگر کرنا شاید میری استطاعت وادراک میں بھی نہیں۔ لیکن اسکے باوجود چند جوانب کی طرف قارئین کے ذہن کو متوجہ کرانا میرے لیے یقیناً ایک سعادت کی بات ہے۔

ابا مرحوم کو دینی وعربی تعلیم سے بے حد شغف تھا۔ چنانچہ جب میری پڑھائی کا آغاز ہوا تو آپ نے دیگر انگریزی اسکولوں کے بجائے روضہ المعارف نامی پبلک اسکول میں داخلہ کروایا۔ دینی بیداری اور عربی زبان پر دسترس حاصل کروانا تھی تا کہ انکے بچے البدایہ والنھایہ، السیرۃ النبویۃ، تفسیر ابن کثیر جیسی بلند پایہ کتابیں بغیر ترجمہ کی مدد سے پڑھیں۔ شاید ہم تینوں کی عربی تعلیم میں کامیابی کے بعد یہ بات محض ایک تاریخی یادداشت معلوم ہوتی ہے لیکن یہ ایک کرامت سے کم نہیں۔ ہر سال جب بھی امتحانات کے رزیلٹ آتے تو ہم بھائیوں کی خوشی اپنے والدین کو اپنے نمبر بتانے میں ہوتی جو کہ بفضل ربی امسال سے بہتر ہوتے لیکن ابا مرحوم کی مطمح نظر صرف دو پرچہ ہوتے: توحید اور عربی قواعد: آپ ہمیشہ فرماتے کہ دوسرے پرچے تو دیگر اسکولوں میں بھی ہوتے لیکن عربی اسکول میں داخلے کی وجہ صرف عقائد کی پختگی (یعنی توحید) اور عربی زبان میں

استعداد (یعنی قواعد) ہی ہے۔

عرب حضرات سے آپ کا تعلق اچھا ہی نہیں بلکہ یہ حسن ظن عشق تک پہونچا ہوا تھا۔ اگر کوئی عرب حضرات کی مسرفانہ اندازِ زندگی کا ذکر کرتا تو آپ شدت سے نکیر فرماتے اور کہتے اگر اسکا عشر عشیر بھی ہم کو یا آپ کو مل جائے تو ہمارے دماغ ساتھیوں آسمان پر ہونگے۔ مزید اس بات کی ہمیشہ پذیرائی کرتے کہ عرب حضرات کبھی بھی غیر عرب کی غلط یا سادہ اندازِ گفتگو کا مذاق نہیں اڑاتے۔ ابا مرحوم اسکو انکی وسعتِ نظری پر محمول کرتے۔ عاجز نے ایک دفعہ ابا مرحوم سے ایک حدیث شریف کا متن ذکر کیا کہ عربوں سے نفرت و بغض فسق کی نشانی ہے۔ اس حدیث سے آپ متاثر ہوتے اور دوسروں کو اپنی تنگ نظری اور زبان درازی سے پرہیز رہنے کو کہتے۔

آپکی ولادت و تربیت ہندوستان میں ہوئی اور جوانی ہی میں آپ نے ترکِ وطن کر کے سعودی عرب میں مستقل طور پر قیام پذیر ہو گے۔ اس کے باوجود حب الوطنی آپ کے اندر بہت معتدل اور بہترین انداز سے سرایت کر گئی تھی۔ چنانچہ ہندوستانی قونصلیٹ کے بیشتر پروگراموں میں بہت مستعدی سے شریک ہوتے۔ اسی ضمن میں اپنے ملک کو ترک کر کے کسی مغربی ملک میں دائمی طور پر منتقل ہو جانے کو آپ بہت نامحبوب سمجھتے تھے۔

صوفیائے کرام نے فرمایا ہے تخلقوا باخلاق الله یعنی اللہ تعالیٰ کی (کریمانہ اور رحیمانہ) صفات سے متصف ہوا کرو۔ چنانچہ ابا مرحوم کسی کا برے طور پر ذکر کرنا یا کسی کی صفاتِ خلقیہ کا طنزیہ طور پر تذکرہ ہونے پر تنبیہ فرماتے۔

علمائے حق سے آپ کو بہت زیادہ تعلق تھا چنانچہ پہلے لکھنؤ میں قیام رہا جہاں متعدد اللہ والے وقتاً فوقتاً دلوں کی گرمی اور مجالس کی رونق بنتے۔ اس کے بعد آپ کا مستقل قیام جدہ میں ہو گیا جو باب الحرمین کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ صغرسنی سے ابا مرحوم اس بات کا اہتمام کراتے

کہ میں انکی معیت میں خاصانِ خدا کے یہاں حاضری دوں۔ بہت کم عمری میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی حاضری مدینہ منورہ میں ابھی بھی یاد ہے۔

شاید یہی تھا علمائے حق اور اہل اللہ سے آپ کا تعلق اور عربی زبان سے آپ کی محبت کہ آپ کی تدفین مقبرہ العدل میں ہوئی جہاں شیخ علی الطنطاویؒ اور شیخ ابن باز اور دیگر علمائے نجد کا جوار نصیب ہوا۔ شیخ علی طنطاویؒ کا عربی زبان پر عبور اور شیخ ابن باز اور علمائے نجد کا توحید سے تعلق کسی سے مخفی نہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی تعلق کی بنا پر آپ کی مغفرتِ تامہ فرمادے۔ آمین۔

اسلامی تہذیب اور لکھنوی ادب کے علمبردار

جناب محمد عبداللہ صدیقی صاحب (جدہ)

میرے والد صاحب مرحوم جناب علیم احمد صدیقی صاحب۔۔۔۔اہل ادب و دین کے نزدیک ایسا نام جس کے متعلق کئی خوشگوار اور سبق آموز واقعات اور قصے منسلک ہیں ایک اچھے دوست، ایک اچھے مرشد و مربی اور ایک اللہ سے ڈرنے والے مسلمان۔

میرے لیے یہ نام ہی نہیں بلکہ ایک شناخت ہے، ایک پہچان ہے اور مدرسۂ فکر ہے جس کے سبق اور ارشادات آج بھی میرے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

عام طور پر سوانح نگاری دو طرز پر ہوتی ہے۔ یا تو مصنف صاحبِ سوانح سے منسلک چند واقعات سے آگاہ کراتا ہے یا پھر صاحب سوانح سے متعلق اور منسلک اتنے واقعات میں شریک ہوتا ہے کہ اسکو خود بہت مشکل ہوتا ہے کہ کہاں سے شروع کروں اور کہاں پر ختم کروں؟ کونسا قصہ بیان کروں اور کون سا نہیں۔ والد صاحب مرحوم کی ہمہ جہت شخصیت اور پچیس ۲۵ برس سے زائد کی رفاقت میں یقیناً یہ مشکل ہے کہ میں کن واقعات، صلاحیتیں اور قصوں کا حسن انتخاب کر کے قارئین کے سامنے پیش کروں۔

میرے نزدیک والد صاحب مرحوم کے کردار کی چار کلیدی صفات تھیں جو انکی شخصیت کو یقیناً ایک قد آور اور بلند مقام شخصیت بناتی تھیں۔ اور وہ تھیں

☆عقیدہ میں رسوخ　☆ماں سے محبت　☆اردو زبان اور لکھنوی تہذیب سے تعلق

☆اللہ اور اللہ والوں سے تقرب کے مواقع کی جستجو میں رہنا۔

ہر اولاد کی دیرینہ تمنا ہوتی ہے کہ وہ اپنے والدین کے خواب پورے کرے ساتھ میں دعا

بھی رہتی ہے کہ جن مقامات پر انکے والدین پہنچے ہیں وہ کم از کم وہاں تک پہونچے اور مواقع ملیں تو اس سے بھی زیادہ ترقی کریں۔

اس بات میں ادنی شک نہیں کہ والد صاحب مرحوم نے جو منازل اور مقامات اپنی مختصر سی زندگی میں طے فرمائے ہیں انکے قریب بھی آنا (اپنی علمی اور عملی کم مائیگی کی وجہ سے) ایک مجاہدہ سے کم نہیں معلوم ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ آپ نے معیارِ محبت وشفقت نہایت بلند کر دیا۔

ویسے تو ہر شخص کی زندگی میں والد کی اہمیت بطور ایک دوست اور مرشد ہونا ایک طبعی بات ہے۔ البتہ آج میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ ایک دوست و مرشد کے علاوہ ایک بے انتہا مشفق، وسیع النظر، اللہ سے قریب، تواضع پسند، منکسر المزاج انسان تھے جن کے اصول آج بھی میرے لیے ایک دریائے علم وادب کے مانند نہ جانے کتنوں کو فیضیاب کر رہے ہیں۔

جب میری پیدائش لکھنؤ میں ہوئی تو اس وقت والد صاحب جدہ میں مقیم تھے اور والدہ صاحبہ لکھنؤ میں ہماری دادی صاحبہ کے پاس تھیں والد صاحب مرحوم نے میرے لیے تین نام تجویز کیے۔ محمد عبداللہ، عبداللہ محمد اور احمد عبداللہ۔ دادی صاحبہ سمجھ گئیں کہ اشارہ واضح ہے کہ نام عبداللہ ہی ہوگا۔ یہ واقعہ والد صاحب مرحوم بہت دلچسپی سے سناتے تھے اور اس بات کو ضرور ذکر کرتے کہ حدیث شریف کا مفہوم ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نزدیک دو نام سب سے زیادہ محبوب ہیں عبداللہ اور عبدالرحمٰن۔ چنانچہ میرے لیے زندگی کی ابتداء میں میرے والد صاحب نے ایک حدیث کو مدنظر رکھتے ہوئے کی۔ ۱۹۷۰ء کے زمانے میں برصغیر میں عبداللہ نام اگر دقیانوسی نہیں تو قدیم اور ''غریب'' نام مانا جاتا تھا۔ مگر والد صاحب مرحوم کے نزدیک اسلام کی نامور شخصیات یقیناً قابل تقلید تھیں (کم از کم نام ہی رکھ کر) آج میں فخر محسوس کرتا ہوں جب لوگ ذکر کرتے ہیں کہ عبداللہ واقعی اچھا نام ہے اور ہمیں یہ راہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان نے دکھائی۔ اسلامی تعلیمات پر عمل کرنا

آج کے دور میں یقیناً ایک ایسا امر ہے جسمیں مددِ خداوندی خود ہی میسر ہوتی ہے۔

جب خاندان کے دیگر افراد میں اپنے بچوں کو بہترین انگریزی اسکولوں میں تعلیم کے لیے بھیجا تب والد صاحب مرحوم اس فکر میں مشغول رہتے کہ جن عربی کتب کا مطالعہ انھوں نے اردو ترجموں کی مدد سے پڑھا یقیناً بہتر ہوتا اگر ان کا مطالعہ بزبان قرآن (جسمیں یہ کتابیں لکھیں گئیں) میں کرپاتے۔ اس خواہش کو والد صاحب مرحوم نے زندگی کا مقصد بنالیا تھا۔ اور ایسا راسخ عزم کرلیا کہ ہندوستان کے ایک خاندان میں عربی اس طرح رائج کرینگے کہ عرب بھی متاثر ہونگے۔ اور بہترین عربی اسکولوں کے ذریعے مجھے اور میرے بھائیوں کو عربی کا وہ عظیم سرمایہ عطا فرمایا جو یقیناً بروز قیامت انکی مغفرت کا ذریعہ بنے گی۔ (آمین) جب خیر خواہوں نے عرض کیا کہ عربی سے دنیوی فائدہ نہیں تو فرماتے کہ انگریزی اور ہندی تو میرے بیٹے کبھی بھی سیکھ سکتے ہیں میں تو چاہتا ہوں کہ وہ احیاء العلوم، البدایہ والنہایہ اور ماذا خسر العالم جیسی کتابیں اپنے اصل مصدر سے پڑھیں تو ظاہر ہوا کہ والد صاحب مرحوم کے قریب دنیا ایک رہ گزر تھی جس کے ذریعہ وہ آخرت کی تیاری میں مصروف تھے۔ آج میں جب عربی زبان میں مقالات لکھتا ہوں اور انگریزی زبان میں دنیا کے نامور اخبارات میں اظہارِ خیال کرتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ بعد اللہ یہ صرف میرے والد صاحب مرحوم کا ایمان اور وثوق تھا جس کی بدولت ہندوستان کا ایک خاندان لغت حجاز ونجد مادری زبان کی طرح بولتا اور لکھتا ہے۔ عربی کا بولا ہوا میرا ہر لفظ میرے والد صاحب کا ذریعہ مغفرت بنے گا۔ (آمین)

یہ نہ تو انکی شخصیت کا ایک پہلو تھا۔ سود سے اجتناب اور گریز ایسے جیسے کسی بلا وکرب سے انسان فرار ہوتا ہے جب ایک عزیز نے یہ کہا کہ سود پر تجارت کرنا جائز ہے ورنہ تجارت نہ ہوگی تو والد صاحب نے صاف الفاظ میں انکی تردید کردی۔ ان صاحب نے کہا اس طرح تو میں بھی تجارت نہیں

کر پاؤنگا۔ والد صاحب مرحوم نے فرمایا: اگر آپ کے پاس شادی کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں تو آپ پڑوسی کی لڑکی کو لے کر روانہ ہو جائینگے؟ ارے بھائی تجارت کے پیسے نہیں تو کیا جب سرمایہ ہوگا تو کرنا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ بے باکی انکو غیر مقبول بنا رہی ہے مگر انکے نزدیک حق کی بات کہنا فرض تھا اور اسپر عمل کرنا ایک عبادت۔ اسمیں کوئی شک کہ وہ یقیناً ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔

والد صاحب مرحوم کا اپنی والدہ ماجدہ سے تعلق ایک انسانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ویسے تو والد صاحب کی شخصیت پر انکے والدین کا عظیم اثر تھا۔ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر ممنون ہوتے کہ اس نے ایسے والد کا بیٹا بنایا جو غریبوں اور حاجت مندوں کی مدد کرتے اور میری والدہ انکے ساتھ چٹان کی طرح رہیں۔ اپنی والدہ کو اپنی ہر خواہش کا سبب مانتے اور متمنی رہتے کہ والدہ کی ہر خواہش مکمل کریں۔ انکی شخصیت کا یہ پہلو مجھ میں اور میرے بھائیوں میں بہت جلی تر اثر کردہ ہے۔ والد صاحب نے ہمیشہ اپنی والدہ ماجدہ کی نظر دیکھی ان حضرات سے ان کا زیادہ تعلق رہتا جو انکی والدہ سے قریب تھے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دادی صاحبہ کے انتقال کے بعد وہ پھر کبھی بھی اپنے آپ کو نامکمل محسوس کرتے اپنی والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد انھوں نے وہ مقصد کھو دیا جس کے وہ ہمیشہ جدو جہد کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ حدیث شریف کا مفہوم ہے والدین کے چہرے پر ڈالی ہوئی ایک نظر حج کا ثواب کے برابر ہے۔ میں گواہ ہوں کہ والد صاحب نے یقیناً اللہ کے دربار میں کئی حج کے ثواب حاصل کیے ہوں گے۔

والد صاحب کے نام کے ساتھ اردو زبان کا ذکر آنا لازمی بات ہے۔ چنانچہ آپ کی ادبی رہنمائی آپ کے خالہ زاد بہنوی غلام احمد فرقت کاکوروی صاحب نے کی۔ اس کے علاوہ انیس احمد عباسی صاحب، علی سردار جعفری صاحب، محترمہ قرت العین حیدر صاحبہ، اور نہ جانے ایسے کتنی علمی و ادبی شخصیات سے آپ کو ادب اردو میں استفادہ کا وقتاً فوقتاً میسر ہوتے رہے۔

خدا تعالیٰ نے عجیب وغریب ادبی وعلمی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ اچھا اور برمحل شعر کا ذکر کرنا ان کا ہنر تھا۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ سے انکو قلبی تعلق تھا۔ اسکی وجہ ان حضرات کی دینی نگارشات میں ادبی مٹھاس کا ہونا تھا۔ اردو سے والد صاحب کو عشق تھا۔ اور اگر آپ اردو زبان کے شیدائی ہیں تو یقیناً لکھنوی تہذیب بھی آپ کا دوسرا عشق ہوگا۔ اس دور میں کسی شخص کو ہزاروں کی تعداد میں اتنے برمحل شعر شاید ہی یاد ہوں۔ اس ضمن میں والد صاحب مرحوم غلام احمد فرقت صاحب اور پھر مولانا یامین عثمانی کے رہینِ منت رہتے۔ آخر کے دس پندرہ سال کافی متفکر رہتے اردو کے مستقبل کو لیکر۔ اردو کا خون اردو والوں نے کیا فرماتے کہ ہمارے گھر کے لڑکے، لڑکیاں ہی اردو نہیں سیکھتے تو غیروں کو کیا ذمہ دار ٹھہرایا جائے۔ شادیوں کے کارڈ انگریزی زبان میں دیکھ کر بہت رنجیدہ اور افسردہ ہوتے۔

آپ کا یہ ماننا تھا کہ اسلام کا سب سے بڑا علمی سرمایہ اردو زبان میں ہے۔ اگر کل کی نسل اردو نہیں سیکھے گی تو یہ سب ضائع ہو جائے گا۔ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی کتابوں کو نئی نسل سے متعارف کرنے کی کوشش کرتے رہتے۔ دہلی ہو یا لکھنؤ، بھوپال ہو یا حیدرآباد ہر تنظیم اور ثنا خواں اردو کی بزم کا حصہ بنتے۔ افسوس صد افسوس کہ والد صاحب مرحوم کی یہ مخلص کوششیں غیر قدرداں حضرات کے لیے کچھ مشکل ہضم تھیں۔ اگر کوئی شخص کہے (مزاج ٹھیک ٹھاک ہیں) تو فرماتے (کیا آپ کوئی کرسی یا بستر ہیں جو ٹھوک ٹھاک کے ٹھیک ہوتا ہے) اگر کوئی کہے (کیا حال چال ہیں) تو فرماتے (حال بفضل ربی ٹھیک ہے البتہ چال اصطبل میں گھوڑوں کی معلوم کی جاتی ہے) اگر کوئی کہتا (ذرا انکو چھوڑ کے آتا ہوں) تو فرماتے (چھوڑ کے نہیں بلکہ پہنچا کے آتا ہوں) مختصراً ہمیشہ کہتے تھے کہ یہ میری دادی اور نانی (آپ کی دادی ملا حمد اللہ سندیلویؒ کے خاندان سے ہیں اور آپکی نانی ملا احمد جیون صاحب کے خاندان سے۔) کی زبان ہے میں اسکو آخر وقت تک صاف ستھری اور غیر

ملوث رکھونگا۔ چنانچہ اسمیں کوئی شک نہیں کہ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہی انکا مدرسہ تھا۔ اس ضمن میں انیس و دبیر، میر و ناسخ انکے غائبانہ طور پر استاد تھے۔ وہ اردو میں ہونے والے مسلسل انحطاط کے لیے ہمیشہ متفکر رہتے تھے۔ جو بے اعتنائی اور لاابالی پن کا سلوک اردو کے ساتھ روز بروز بڑھتا جارہا ہے یقیناً والد صاحب مرحوم کے لیے ایک صبر ازما آزمائش سے کم نہ ہوتا۔ والد صاحب مرحوم اپنے ایک غیر مسلم مراٹھی دوست کا جملہ ہمیشہ فخر اور امتنان کے طور پر دہراتے کہ ''لکھنؤ تو وہ جگہ ہے جہاں نوکروں کو نام سے نہیں پکارتے بلکہ عزت سے چچا اور ماموں کہتے ہیں۔'' افسوس لکھنؤ آج وہ تہذیب کا گہوارہ نہیں رہا اور ہم سب اس کے ذمہ دار ہیں

والد صاحب مرحوم راسخ العقیدہ مسلمان تھے ہی ساتھ میں اللہ والوں سے انکا تعلق انسانی فکر سے کہیں بالاتر ہے۔ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ، مولانا ابرار الحق صاحبؒ، حکیم اختر صاحبؒ، مولانا محمد رابع ندوی صاحبؒ، حضرت قاری امیر حسن صاحبؒ، صوفی عبدالرحمٰن صاحبؒ، مولانا محمد یامین عثمانی اور نہ جانے کن کن اولیاء اللہ اور مشائخ عظام سے والد صاحب کے گہرے تعلقات تھے۔ یہ تعلق یقیناً آسمانی تھا یہ حضرات ہمیشہ والد صاحب کی وجہ سے متفکر رہتے۔ یہ والد صاحب مرحوم کی صاف دلی اور منکسر المزاجی ہی تھی جس کا نعم البدل انکو ہمارے چھوٹے بھائی یوسف سلمہ کی دینی سرگرمیوں کی شکل میں میسر ہوا۔ آج انکا بیٹا دین کو اہلِ دنیا تک پہنچانے کی کوشش کررہا ہے۔ سفر طویل ہے مگر جب والد صاحب مرحوم نے مبارک ابتداء کردی ہے تو راستہ اور منزل خود ہی سہل ہو جائینگی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اہل اللہ سے تعلق کے سلسلے میں والد صاحب مرحوم فرماتے تھے (اگر گانے بجانے والوں سے محبت کروگے تو قیامت کے دن اُنکے ساتھ حشر ہوگا اور اگر اللہ والوں سے قرب رکھوگے تو قیامت کے دن انکے ساتھ جنت میں ہوگے) جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے تو

آنکھیں نم ہو جاتیں، جب صحابہ کرام کی عظمت کا ذکر کرتے تو آنکھیں شوقِ ملاقات کو ترستیں۔ جب امام اعظمؒ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبلؒ کا ذکر کرتے تو تعریفاً انکی عظمت کا ذکر کرتے۔ جب ہندوستان کی عظیم الشان ہستیوں کا ذکر آتا تو حضرت معین الدین چشتیؒ، مولانا الیاس کاندھلویؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلویؒ اور مولانا علی میاں ندوی صاحبؒ کا ذکر کرتے تو شکر کرتے کہ اللہ نے ایسے ملک میں پیدا کیا جہاں کے علمائے کرام نے پیغام خداوندی کو دلوں سے لگا کر رکھا۔ ہر نماز کے بعد ان عظیم الشان حضرات کی مغفرت کی دعا کرتے اور دعا کرتے کہ اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کو نور سے بھر دے۔

اہل عرب سے والد صاحب کا تعلق بھی ایک انسانوی حیثیت رکھا ہے۔ ہمیشہ کہتے تھے یہ وہ مبارک سرزمین ہے جہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم چہ جائیکہ صحابہ کرام نے اپنی مبارک زندگیوں کے لمحے گزارے ہیں۔ یہ لوگ اور یہ جگہ بھی اللہ کے بہت قریب۔ ہر نماز کے بعد دعا کرتے کہ ''اے اللہ میرا اور میری اولاد کا تعلق ہمیشہ اس مبارک سرزمین سے قائم رکھنا، آمین۔

والد صاحب مرحوم کی دعا کا معمول اور اہل اللہ سے تعلق نے شاید یہ رنگ دکھلایا کہ آپ کا آخری سفر مکہ مکرمہ سے شروع ہو کر حرمِ مکی سے گزر کر جبل النور کی گود میں ختم ہوا۔ آج اس قبرستان میں آپ آرام فرما رہے ہیں جہاں پر مفتیٔ اعظم سعودی عرب اور دیگر علمائے جزیرہ عرب بھی آرام پذیر ہیں۔

سچ یہ زندگی ایک رہ گزر تھی اور والد صاحب مرحوم نے آخرت کا انتظام وقتاً فوقتاً کیا۔ اللہ انکی قبر کو نور سے بھر دے۔ (آمین)

ویسے والد صاحب کا ذکر کیا جائے تو ہماری والدہ ماجدہ کا ذکر آنا لازمی ہے۔ والدہ صاحبہ

نے ہمیشہ والد صاحب کی مذکورہ بالا چار صفات: عقیدہ کی پختگی، والدہ سے محبت، اردو سے تعلق اور اہل اللہ سے تعلق میں انکا ساتھ بخوبی نبھایا۔ والد صاحب فرماتے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ سب سے پہلے ام المؤمنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے دیا اور میرا ساتھ میری اہلیہ دیتی ہیں۔ ایک مکمل خاتون جنھوں نے والد صاحب کی دینی اور ادبی کاوشوں اور سرگرمیوں کی ہمیشہ تائید کی۔ فرماتیں کہ سخت وقت تو گزر جاتا ہے مگر اللہ سے تعلق ہمیشہ قائم رہنا چاہیے۔

والد صاحب اگر ایک مدرسۂ فکر و نظر تھے تو والدہ صاحبہ وہ عمارت تھیں جسمیں وہ مدرسہ عروج پر پہنچا۔ ایک مردِ مومن اور ایک راسخ العقیدہ مسلمان خاتون۔

وقت گزر جاتا ہے مگر انسان کے افکار، تربیت، دین سے تعلق، اللہ سے تعلق ہی وہ ذخیرہ ہے جو اسے عظیم درجات پر فائز کرتا ہے۔ آج جب میں مڑ کر دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ علیم احمد صدیقی ایک نام ہی نہیں بلکہ ایک شناخت ایک مدرسہ ایک مخزنِ علم، ایک مشعلِ راہ اور ایک گہوارۂ علم و ادب بن چکا ہے۔ اس مشعل علم و ادب کو زندہ رکھنا اب ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ قارئین کو اس میں کسی قسم کا غلو یا مبالغہ آرائی کا احساس نہیں ہوگا اگر کہا جائے کہ آپ حقیقت میں اسلامی تہذیب اور لکھنوی ادب کے سچے مگر گمنام علمبردار تھے۔

دہلی میں علیم صدیقی۔کچھ یادیں

محترمہ حبیبہ نورانی مرحومہ (لکھنؤ)

- بیگم سید امیر حسن نورانیؒ -

چلا گیا وہ اجالے سمیٹ کر اپنے
طویل راہ گذر تھی چراغ کیا کرتا

کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے، موت ہماری زندگی کا ایک کڑوا سچ ہے۔لیکن رگِ ناگہانی ایک ایسا سچ ہے کہ جس کی حقیقت کو دل و دماغ تسلیم کرنے کو قطعی تیار نہیں ہوتا۔لیکن انسان مجبور محض ہے۔فلکِ بحرفنا کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ایک صحت مند، تندرست وتوانا انسان دیکھتے دیکھتے ہماری نظروں سے اوجھل ہوجائے دل یقین کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔لیکن مشیتِ ایزدی میں کسی کا کیا دخل! علیم صدیقی کی ناگہانی موت بھی اسی طرح کا ایک سنگین حادثہ ہے۔

علیم صدیقی کا تعلق لکھنؤ کے ایک معزز خاندان سے تھا۔ان کے والد ڈاکٹر محمد عظیم احمد صدیقی صاحب ایک مشہور ومعروف معالج تھے۔علیم صدیقی ڈاکٹر صاحب کے بڑے بیٹے تھے۔انتہائی خلیق، ملنسار، اور خوش مزاج تھے۔بذلہ سنجی انکی شخصیت کا اہم پہلو تھا۔فنِ مزاح تو گویا انہیں وراثت میں ملا تھا۔ان کا آبائی گھر لکھنؤ میں مصطفیٰ منزل کے نام سے مشہور ہے جہاں آج کل ان کے چھوٹے بھائی کلیم احمد صدیقی صاحب رہتے ہیں۔

ملازمت کے سلسلے میں انہوں نے لکھنؤ چھوڑ کر دہلی میں قیام کیا۔دہلی میں رہ کر انہوں نے کچھ ملازمت کی۔ان کی بیگم صاحبہ قصبہ بانسہ (بارہ بنکی) کی ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔اُن دنوں ان کی رہائش پونہ میں تھی وہ دہلی آتی جاتی رہتی تھیں۔

علیم صاحب کی ایک ہمشیرہ میرے ماموں سید محمد عثمان عابدی کی شریکِ حیات ہیں ۔دوسری بہن میرے دوسرے ماموں زاد بھائی شمشاد حسین عابدی سے منسلک ہیں ۔اس لئے ہم لوگوں کی علیم صاحب سے اچھی واقفیت تھی۔

میرے شوہر سید امیر حسن نورانی صاحب مرحوم دہلی یونیورسٹی میں لکچرر تھے۔اس لئے ہم سب کا قیام دہلی میں تھا۔نورانی صاحب کے ایک قریبی اور گہرے دوست غلام احمد فرقتؔ کاکوروی (جن کا شمار اردو کے بلند پایہ طنز ومزاح نگاروں میں کیا جاتا ہے) وہ بھی شام کا بیشتر وقت ہمارے یہاں گذارتے تھے۔علیم صاحب (جو ان کے خالہ زاد برادرِ نسبتی اور شاگرد بھی تھے) کو بھی اکثر اپنے ساتھ لے آتے تھے۔پھر یہ سب مل کر مختلف موضوعات پر تبادلہء خیال، بحث ومباحثہ جن میں دینی مسائل، سماجی وسیاسی شخصیات پر تبصرے، شعر وشاعری غرض یہ کہ ایک چھوٹی سے ادبی محفل کا انعقاد ہو جاتا تھا۔اور دیر رات تک اس محفل کو اپنے طنز ومزاح اور لطائف سے زعفران زار بنا کر محفل برخاست ہوتی تھی۔مرحوم فرقت کاکوروی صاحب کا کہنا تھا کہ یہاں آکر مجھے لکھنؤ کا ماحول ملتا ہے اس لئے میں روز چلا آتا ہوں ۔انہوں نے غالب خستہ کے بغیر کتاب بھی اُنہی دنوں لکھی تھی۔

علیم صاحب بہت ہی نیک دل اور وضعدار انسان تھے۔خلوص اور اپنائیت کا جذبہ ان میں بدرجہء اتم موجود تھا۔اس سلسلہ میں ایک واقعہ مجھے بھی اکثر یاد آتا ہے جو ان کے خلوص کی بھر پور ترجمانی کرتا ہے۔میرے اصرارِ بے حد پر وہ اکثر میرے یہاں کھانا کھاتے تھے۔ایک دن غالباً چھٹی کا دن تھا وہ خلافِ معمول صبح کے وقت گھر آئے اور شام کو ہم سب کو اپنے گھر کھانا کھانے کے لئے مدعو کیا۔میں سمجھی کہ شاید ناہید (ان کی بیگم صاحبہ) آگئی ہیں۔معلوم ہوا کہ نہیں آئی ہیں بہ اصرار منع کیا کہ کیسی بات کررہے ہو ان کے آنے پر ضرور آؤنگی۔مگر وہ کسی طرح نہ مانے اور کہا کہ "میں

نے انتظام کرلیا ہے، شام کو ضرور سب کو آنا ہے۔آپ کے ہاتھ کا پکا کھانا تو بہت کھاتا ہوں ایک دن میرے ہاتھ کا پکا بھی کھایئے مجھے خوشی ہوگی''۔ان کے بے حد اصرار سے مجبور ہو کر ہم لوگوں کو جانا پڑا۔اسٹو، بریانی اور سلاد دیکھکر حیرت ہوئی۔ کہ کیسے انہوں نے تیار کیا ہوگا۔روٹی اور کباب بازار سے لاکر ہم لوگوں کو کھانا کھلایا۔ میں بے حد شرمندہ تھی۔مگر وہ بے انتہا خوش تھے۔کھانے کی تعریف سن کر بہت خوش ہوئے۔حقیقتاً یہ کھانا انہی نے تیار کیا تھا اپنے ہاتھوں سے، یہ تھی ان کی خصوصیت کو جو ایک بار ان سے ملتا تھا وہ بار بار ملنے کا خواہش مند ہوتا تھا۔میرے دونوں لڑکے ان سے اس قدر مانوس تھے کہ شام کو ان کے آنے پر کھیل چھوڑ کر ان کے پاس بیٹھ جاتے تھے اور ان سے طرح طرح کے کھیل تماشے سیکھتے تھے اور بہت خوش ہوتے تھے۔

ایک دن باتوں میں تذکرہ ہوا کہ نورانی صاحب ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل ہیں ،عربی اور فارسی زبان پر انھیں عبور حاصل ہے۔تو انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں بھی عربی سیکھنا چاہتا ہوں۔روزانہ وہ نورانی صاحب سے عربی پڑھتے تھے۔پھر ایک دن اچانک انہوں نے دہلی چھوڑ کر سعودی عرب جانے کا فیصلہ کرلیا۔یوں تو اپنے وطن میں روزگار کے ذرائع و وسائل کی کمی نہیں ہے لیکن کبھی کبھی تقدیر کے ہاتھوں انسان مجبور ہو جاتا ہے اور یہی ان کے ساتھ ہوا۔سعودی عرب کی مقدس سرزمین نے ان کا بھرپور خیر مقدم کیا۔اور انہوں نے وہاں جا کر خوب ترقی کی ۔کاروبار میں بھی کامیابی ملی، وہاں رہ کر انہوں نے سماجی اور ادبی سرگرمیوں میں بھی خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، جدہ میں آئے دن ہونے والی ادبی مجالس اور مشاعرہ وغیرہ کا انعقاد انھیں کے زیرِ نگرانی ہوتا تھا۔ایک بہترین منتظم کی ساری صلاحیتیں ان کے اندر بدرجہ اتم موجود تھیں۔یوں تو وہ متعدد بار اپنے اعزہ و اقارب سے ملنے آتے رہے لیکن گذشتہ برس (۲۰۰۱ء) جب وہ اپنے سب سے بڑے بیٹے وقار سلمہ کی شادی کرنے لکھنؤ آئے اور یہاں کے سب اعزہ و احباب سے مل کر واپس

گئے تو وہ ان کا لکھنؤ کا آخری سفر ثابت ہوا۔شاید قدرت کو یہی منظور تھا۔اس دردناک اور جانکاہ حادثہ نے سب کو غمگین اور حیرت زدہ کر دیا۔

ماضی کے افق پر سارے واقعات جو ذہن میں آج تک محفوظ ہیں یکے بعد دیگرے ابھرنے لگے۔دل کسی صورت اس خبر پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔حالانکہ موت ایک اٹل حقیقت ہے لیکن اس حادثہ پر اگر یہ کہے تو غلط نہ ہوگا

موت تو برحق ہے لیکن اتنی محبت کس لئے
گم نصیبوں کے لئے یہ دردِ فرقت کس لئے

پیرِ جواں سال: علیم صدیقی مرحوم

جناب شریف اسلم صاحب (جدہ)

ویراں ہے میکدہ خم وساغراداس ہیں
تم کیا گئے روٹھ گئے دن بہار کے

''شریف بھائی آپ عید کی جتنی بھی محفلیں سجائیں انمیں سے کسی بھی محفل میں ہمیں نہ بھولنا۔ہم نے کہا حضور یہ کیسے ممکن ہے ہم کوئی محفل سجائیں اور آپ کو بھول جائیں۔

کیا بھروسہ ہے زندگی کا
آدمی بلبلہ ہے پانی کا

لگ بھگ ربع صدی قبل باب الحرمین عروسِ بحر احمر جدہ میں آمد کی ابتدائی ایام میں جن دلنواز شخصیات سے راہ ورسم قائم ہوئی انمیں علیم صدیقی ایک نمایاں شخصیت تھے۔انکا یہ وصف خاص ہمیں بہت بھلا لگا کہ وہ بچوں میں بچے جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بوڑھے بن جاتے۔

بات میں بات پیدا کرنا، برمحل برجستہ اشعار سنانا ہر محفل میں خوش دلی آمادگی اور جوش وخروش سے شریک ہونا اور اپنی گل افشانئ گفتار سے محفل کو زعفران زار بنا دیا۔مرحوم علیم صدیقی کی ایسی امتیازی خصوصیت تھی جسکی بدولت وہ تمام طبقات میں ہر دل عزیز اور قابلِ احترام بن گئے تھے۔

مرحوم کی ایک اور ادا تھی جھٹ خفا ہو جانا راقم الحروف کو شروع شروع میں بڑی الجھن ہوئی کہ ان سے نبھا کریں تو کیسے کریں بنیادی طور پر انکی نیک نفسی نیک نیتی اور نیک دلی آڑے آ گئی یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھار گرما گرمی کا ماحول بن جاتا۔امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ باہمی مراسم

مضبوط سے مضبوط تر ہو گئے۔

امامِ تغزل حضرت جگرؔ کیا خوب فرما گئے ہیں:

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ

مرحوم علیم صدیقی دلوں کو فتح کرنے کا ہنر خوب جانتے تھے۔ سوگواروں کے اس ہجوم میں انکی ایک ایک ادا یاد آتی ہے۔

مرحوم کی ایک اور خاص شائبہ تھی جب بھی کسی محفل میں تقریر کرنا ہو کلام سنانا ہو بحث وتمحیص میں حصہ لینا ہو تو پہلے سے اسکی بہت اچھی تیاری کر کے آتے۔ ایک جگہ موضوعاتی نظم سنا رہے ہیں تو دوسری جگہ مقالہ پڑھ رہے ہیں تیسری جگہ اپنی بیگم محترمہ ناہید صدیقی کے ہمراہ کوئز کامپیٹیشن میں بیٹھے ہیں چوتھی جگہ بیت بازی میں حصہ لے رہے ہیں۔ بس یوں سمجھئے مرحوم اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ایسی ہمہ جہت اور ایسی ہمہ صفات شخصیت کا دائمی طور پر جدا ہو جانا یقیناً اس قحط الرجال میں ایک اور صدمہ جانکاہ سے کم نہیں۔

ادبی اور شعری محافل کے علاوہ اسپورٹس اور گیمس میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ باشندگانِ ہند کی سماجی تنظیم انڈیا فورم ہو کہ انڈین رائٹرز فورم بزمِ اردو ہو کہ زندہ دلانِ جدہ انجمن شعرائے ہند ہو کہ انجمنِ فروغ اردو غرض تمام ادبی شعری سماجی ورفاہی انجمنوں کو اپنی ذاتِ والا صفات سے مستفیض کرتے۔

خاکِ طیبہ ٹرسٹ کے بے مثال خدمات کے اتنے معترف تھے کہ اسکے تمام جلسوں، سمیناروں مباحثوں اور مشاعروں کا جُز ''لاینفک'' بن گئے تھے۔ زورِ خطابت بھی ویسا ہی اور زورِ قلم بھی ویسا ہی۔ مجلّہ ترتیب دینا ساوئنیر ایڈیٹ کرنا اسکو حسنِ صورت اور حسنِ سیرت سے آراستہ کرنا

اچھے سے اچھے مضامین شامل کرنا اسکے لئے دوڑ دھوپ کرنا محبوب مشغلہ تھا۔

راقم الحروف کی بنا کردہ انجمنِ زندہ دلانِ جدہ کی محافل لطیفہ گوئی میں تازہ بہ تازہ نو بہ نو لطائف کے ساتھ شریک ہوکر اس شعر میں پیغام کو عام کرتے کہ

خزاں کے دور جو مسکرا نہیں سکتے

وہ لطفِ فصلِ بہاراں اٹھا نہیں سکتے

مرحوم کے وجود کی زندگی اور زندہ دلی سے عبادت تھا۔ ابھی حال ہی میں جدہ میں منائے گئے جشنِ خواہ مخواہ میں جناب جی ایم احمد خواہ مخواہ کو منظوم خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے طنز و مزاح کے فروغ وارتقاء میں خواہ مخواہ صاحب اور انکی فکرِ وسخن کو اردو ادب کا قابلِ فخر سرمایہ قرار دیکر زندہ دلانِ جدہ کی بھرپور نمائندگی کی۔

صاحبو! آیئے اخر میں علیم صدیقی جیسی باغ و بہار شخصیت کے خاندانی پس منظر پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لیں۔

وطن مالوف یوں تو جانِ عالم واجد علی شاہ کی سرزمین لکھنؤ تھی لیکن انھیں گہوارہ علم و دانش حیدرآباد خرخندہ بنیاد سے بھی ایک نسبتِ خاص تھی۔

انکی بیگم محترمہ ناہید صدیقی کی ولادت باسعادت اورنگ آباد کے نامور علمی وادبی گھرانے میں ہوئی۔ یہ شہر سابق ریاست حیدرآباد کے علاقے حیدر گھوڑے کا صدرِ مستقر تھا۔ محترمہ ناہید صدیقی کے والدِ گرامی جناب انوار اللہ صدیقی نے اورنگ آباد میں اور پھر حیدرآباد میں کئی نامور تعلیمی اداروں کی سربراہ اور پرنسپل کے حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس خانوادے کی دخترِ نیک محترمہ ناہید صدیقی سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد علیم صدیقی دکن اور باشندگانِ دکن سے قریب قریب تر ہوگئے۔

زائداز تین دہے قبل لکھنؤ سے نقلِ مکانی کر کے جدہ آئے۔اور پھر یہیں کے ہوکر رہ گے جدہ آنے سے قبل مرحوم علیم صدیقی بمبئی ڈانٹگ کے دھلی آفس سے وابستہ تھے۔

ڈاکٹر عظیم احمد صدیقی کے فرزند دلبند علیم صدیقی کے چار بھائی ہیں۔حلیم احمد صدیقی، سلیم احمد صدیقی، کلیم احمد صدیقی اور محمد شعیب صدیقی۔انسے منجملہ حلیم احمد صدیقی پاکستان میں منصب وزارت پر فائز رہ چکے ہیں۔تین بھائی پاکستان میں اور ایک لکھنؤ میں ہیں۔تینوں بہنیں ہندوستان میں ہی ہیں۔

علیم صدیقی مرحوم کے دو صاجزادے وقار احمد صدیقی اور محمد عبداللہ صدیقی بہ اعتبار پیشہ انجینیر ہیں اور جدہ میں بہ سر ملازمت ہیں۔تیسرے صاجزادے یوسف عظیم صدیقی پونہ میں زیرِ تعلیم ہیں۔

بہر حال

سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے　　ورنہ اتنے تو مراسم تھے کہ آتے جاتے

علیم صدیقی جدہ کی ایک ممتاز شخصیت

جناب رشید انصاری صاحب (حیدرآباد)

(شائع شدہ منصف، ۳۱/ مارچ ۲۰۰۲ء)

لوگ عام طور پر کسی کو اچھا سمجھتے ہیں تو اس فرد کی ہر بات لائقِ تحسین وستائش مانی جاتی ہے اور اگر کسی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا ہے تو پھر اسکی پسندیدہ باتیں بھی یا تو تسلیم نہیں کی جاتی ہیں یا اگر تسلیم بھی کی جائیں تو انکی ستائش سے گریز کیا جاتا ہے۔ لیکن مرحوم علیم صدیقی کی بات ہی اور تھی زیادہ تر لوگ انھیں بہت زیادہ پسند کرتے تھے اور کچھ لوگ ان کو بہت زیادہ پسند نہ کرنے کے باوجود بھی مرحوم کی بے شمار خوبیوں میں سے چند خوبیوں کے ہر حال میں معترف رہتے تھے اور انھیں نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ ہر محفل پر مکتب فکر میں ہاتھوں ہاتھ لیے جانے والے علیم صدیقی نے جدہ میں ۱۹ فروری کو دائمی اجل کو لبیک کہا۔ حج اور بقرعید پر جدہ سے آئے احباب کی زبانی یہ اندوہناک خبر سنکر علیم بھائی کا مسکراتا ہوا چہرہ نظروں کے سامنے آ گیا۔ علیم صدیقی صاحب اپنے ہر ملنے والے خواہ وہ عمر میں ان سے بڑا ہو یا چھوٹا علیم بھائی تھے۔ چھوٹوں کے لئے انکی محبت وشفقت تو خیر علیم بھائی تھے۔۔۔ مستحق ومتقاضی تو تھی ہی لیکن ان سے بڑے بھی علیم بھائی کے ساتھ بھائی کا لاحقہ لگا کر اپنی برادرانہ اخوت کا مظاہرہ ضروری سمجھتے تھے۔

جدہ میں طویل قیام کے دوران راقم الحروف کے علیم بھائی سے انتہائی قریبی ومخلصانہ روابط رہے۔ ہمارے تعلقات میں ایک مرتبہ ایک ناخوشگوار موڑ بھی آیا تھا اللہ ہی جانتا ہے کہ غلطی کس کی تھی لیکن یہ علیم بھائی کا بڑا پن، فراخدلی اور انتہائی درجہ کی منکسر المزاجی تھی کہ مرحوم نے اپنی غلطی تسلیم کرنے اور معذرت خواہی میں تاخیر نہیں کی اور آپسی تعلقات ومراسم کو مزید تلخ ہونے اور

منقطع سے بچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ورنہ یہ تو ہمارا اور آپکا روز کا مشاہدہ ہے کہ فی زمانہ ہمیں ہماری انا کا خول اپنی غلطی تسلیم کرنے ہی نہیں دیتا تو معذرت تو بہت بڑی بات ہے۔علیم صدیقی کا یو پی کے ایک معروف وممتاز علمی گھرانے سے تعلق تھا۔تقریباً ۳۰ سال قبل وہ جدہ تشریف لے گئے تھے اور وہیں کے ہوکر رہ گئے اور مکہ مکرمہ کے قبرستان العدل میں پیوند خاک ہوئے۔علیم صدیقی جدہ کے تمام اردوداں حلقوں میں یکساں طور پر مقبول تھے۔پاکستان سے تعلق رکھنے والے علمی وادبی حلقوں میں وہ ایک جانی پہچانی شخصیت تھے۔پاکستانی ادبی تنظیموں کی تقاریب میں وہ بصد احترام وہ خلوص بلائے جاتے تھے کئی پاکستانی ادیبوں وشاعروں سے انکے مخلصانہ روابط تھے جدہ میں مقیم تمام ہندوستانیوں میں بلا لحاظ صوبہ علاقہ خاصے مقبول تھے۔شمال اور جنوب کے درمیان وہ ایک پل کی طرح تھے۔یو پی دہلی اور بلا لحاظ صوبہ علاقہ خاصے مقبول تھے۔یو پی دہلی اور بہار کے صوبوں سے تعلق رکھنے والوں میں وہ جتنے مقبول تھے اتنے ہی مقبول وہ حیدرآبادی حلقوں میں بھی تھے۔ویسے تامل ناڈو مہاراشٹرا کرناٹک اور کیرالہ کے باشندوں میں بھی انکی مقبولیت کا گراف ہمیشہ بلند رہا۔لیکن حیدرآباد دکن آصف جاہی سلطنت کی مرحوم ریاست حیدرآباد، جامعہ عثمانیہ اور حیدرآبادیوں سے انہیں خاص انسیت تھی کیونکہ انکے سسرال کا تعلق سابقہ ریاستِ حیدرآباد سے تھا اس لئے انھیں حیدرآبادی حلقوں میں از راہ مذاق حیدرآباد کا داماد کہا جاتا تھا، جدہ کی بعض ممتاز تنظیموں میں جن میں بزمِ اتحاد، خاکِ طیبہ ٹرسٹ، بزم اردو، انجمن طلبائے قدیم جامعہ نظامیہ اور بزم عثمانیہ کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے بلکہ ان کی تمام تنظیموں کے لئے انکی خدمات ناقابل فراموش ہیں، خاک طیبہ کی جانب سے منعقدہ کل ہند عظیم الشان مشاعرے کے موقع پر جو سوئیر شائع ہوئی تھی اسکو علیم صدیقی نے ہی ترتیب دیا تھا۔مجلس اتحاد المسلمین کے وہ نہ صرف مداحوں میں تھے بلکہ مجلس کے قائدین جب جدہ میں ہوئے تو وہ انکے استقبال واعزاز میں

منعقد ہونے والی تقاریب میں اپنی شگفتہ ومرصع تحریر وتقریر سے یا شاعری سے جادو جگاتے۔

علیم صدیقی مرحوم نے اپنی خداداد صلاحیتوں کا مناسب استعمال نہیں کیا۔ نثر لکھنے میں انہوں نے اپنی قابلیت وعلمیت کا خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا اور نہ ہی سنجیدگی سے بھی اس طرف توجہ دی جلسوں اور تقاریب کے لئے وہ وقتی ضرورت کے تحت قلم برداشتہ جو لکھنا ہوتا لکھ ڈالتے، پتہ نہیں اپنی تحریروں کو انہوں نے محفوظ بھی رکھا ہے یا نہیں؟ شاعری انھوں نے خاصی دیر سے شروع کی تھی جدہ کے مشاعروں میں انھیں مدعو کیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ریاض میں انھوں نے مشاعرے پڑھے۔ سفارت خانۂ ہند اور قونصل خانۂ ہند (جدہ) کی جانب سے جدہ وریاض میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں بھی مرحوم نے کلام سنایا تھا ''اردو'' کے عنوان سے انکی نظم خاصی مقبول ہوئی تھی انکا شعری ذوق بہت عمدہ تھا۔ اشعار بھی انھیں غضب کے یاد تھے ہر موقع پر برجستہ عمدہ اشعار سنانے میں انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ اپنی تحریر اور تقریر کو عمدہ اشعار سے سجانے میں انہیں خاص مہارت تھی۔ سعودی عرب ریڈیو کی اردو سروس نے علیم صدیقی مرحوم کو تقریر کے لئے کئی بار مدعو کیا تھا ریڈیو ریاض نے ان سے لیا گیا انٹرویو بھی نشر کیا تھا۔

جدہ سے شائع ہونے والے اردو نیوز اور اردو میگزین کی اشاعت کے آغاز ہی اس میں انکے مضامین وکلام شائع ہوتا رہا تھا۔ ہندوستانی سفارت خانہ اور قونصل خانۂ ہند (جدہ) میں وہ خاصے مقبول تھے۔ سفیر ہند اور قونصل جنرل اور دیگر سفارتی عہدیداروں اور کارکنوں سے انکے روابط ہمیشہ قریبی رہے۔ اپنے تعلقات سے وہ دوسروں کو بھی فائدہ پہنچانے میں پیش پیش رہے تھے۔ سفارتی عہدیدار بھی ادبی وسماجی تقاریب کے انعقاد میں انکی خدمات سے استفادہ کرتے تھے۔

مرحوم کے چھوٹے بھائی کیپٹن حلیم صدیقی پاکستان کی مشہور اور اہم شخصیت ہیں۔ مسلم

لیگ کے اعلیٰ عہدہ دار ہونے کے علاوہ مرکزی وزیر بھی رہے ہیں۔اس تعلق کو وہ مصلحت کی خاطر چھپاتے تھے۔اور نہ ہی بلاوجہ اس کا اظہار فخریہ انداز میں کبھی کرتے تھے۔

علیم بھائی کی انسانیت دوستی انکا جذبہ ہمدردی اور ہر ایک کی حتی الامکان مدد کرنے کا انکا جذبہ انکے کردار اور شخصیت کا نمایاں پہلو ہے۔وضعداری بھی ان میں بدرجہ اتم تھی دکھ تو اس بات کا ہے کہ علیم بھائی وہ مقام نہ حاصل کر سکے جس کے وہ مستحق تھے۔اللہ سے دعا ہے کہ آخرت میں ان پر اپنی اعلیٰ و بہترین رحمتوں کا بہ کثرت نزول فرمائے (آمین)

علیم بھائی: ایک زندہ جاوید کردار

محترمہ تبسم محسن علوی صاحبہ (جدہ)

موت اسکی ہے جسکا کرے زمانہ افسوس ورنہ
دنیا میں آئے ہیں سبھی مرنے کے لئے

جسم اور روح کی ہم آہنگی کے ملاپ کا نام زندگی ہے۔ جسم اور روح کی تقسیم کو ہم موت کے نام سے پکارتے ہیں۔ خدائے لم یزل کے سوا ہر شئے ہر مخلوق فنا کی طرف گامزن ہے۔ زندگی اور موت کا یہ تسلسل قیامت تک جاری رہے گا۔

جہاں زندگی خوشی کی نوید بن کر نزول پذیر ہوتی ہے وہاں موت ایک المیہ دُکھ بن کر دل پنہاں خانوں میں پھُر سے جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک موت کی خبر ہمارے بہت عزیز پُرشفیق محبت اور خلوص کے پیکر علیم بھائی مرحوم کی تھی جو ہمیشہ ہم عزیز و اقارب کے دلوں میں زخم بنی تڑپتی رہے گی۔

۲۰۰۲ء میں جب ہمارے والدین حج کی سعادت کے لئے سرزمین حجاز تشریف لائے تو ہمیں بڑی خواہش ہوئی کہ انکی ملاقات علیم بھائی اور ناہید بھابھی سے ضرور کرائی جائے۔ مگر حج کی مصروفیات اور والدین کی یہ خواہش کہ وہ زیادہ تر وقت مکۂ مکرمہ کی پُرنور ساعتوں میں گذارنا چاہتے ہیں اس بنیاد پر ہماری خواہش ادھوری ہی رہ گئی۔ حج کی تیاریوں کے دوران یہ خوشخبری ملی کہ علیم بھائی کے بڑے بیٹے اور انکی بیوی بھی اس سال حج کی سعادت حاصل کریں گے۔ ۷ ذی الحجہ کی صبح کو اپنی مصروفیات سے وقت نکال علیم بھائی اور ناہید بھابھی سے بات کرنی چاہی تو انکی انگیج کی ٹون نے مایوس کر دیا خیر سوچا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ حج کی سعادت کے بعد علیم بھائی اور ناہید

بھابھی سے ملاقات کریں گے۔مگر افسوس صد ۱۳ ذی الحجہ کو حج مبرور کی سعادت کے بعد جو جدہ واپسی ہوئی تو روبینہ (اسعد صدیقی کی اہلیہ) سے فون پر روح فرسا خبر سننے کو ملی کی کہ علیم بھائی ۷ ذی الحجہ کی شام اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئے۔دل کے جان لیوا دورہ سے وہ ہسپتال بھیجنے سے پہلے ہی اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔انا اللہ انا الیہ راجعون۔

علیم بھائی سے ہماری پہلی ملاقات مئی ۱۹۸۸ء میں اس وقت ہوئی جب ہم پہلی مرتبہ اپنے شوہر کے ساتھ سرزمین حجاز پہنچے تھے۔خاندانی تقریب میں ہمارا ان سے تعارف ہوا۔پہلی ہی ملاقات میں علیم بھائی کی پُر شفقت پُر خلوص باغ و بہار شخصیت نے دل میں گھر کرلیا۔ناہید بھابھی جس قدر سادہ مزاج، کم سخن، سنجیدہ محتاط طبیعت محسوس ہوئیں علیم بھائی اتنے ہی سخن نواز، ملنسار، شگفتہ مزاج تھے۔مزاجوں کے اس تضاد کے باوجود ان کے درمیان کی ذہنی ہم آہنگی کو ہر ملنے والا محسوس کرسکتا تھا۔اور انکی اب اچانک وفات کے بعد ناہید بھابھی کو دیکھتے ہی ان کے ادھورے پن کے احساس اور علیم بھائی کی یادیں تازہ کر دیتا ہے۔

علیم بھائی لکھنؤ کے ممتاز و معروف علمی و ادبی گھرانے کے روشن چشم و چراغ تھے آپ تین بہنوں اور چار بھائیوں میں سے سب سے بڑے بیٹے تھے لکھنؤ سے ہی آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور لکھنؤ یونیورسٹی سے بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔۱۹۷۴ء میں لکھنؤ سے ہجرت کر کے سرزمین جدہ میں برسرِ روزگار ہوئے اور پھر اسی سرزمین کو اپنا وطن بنالیا۔اس سرزمین حجاز کو اپنا وطن بنانے کے باوجود علیم بھائی ہمیشہ اپنے ماضی سے جڑے رہے اپنے حال اور مستقبل میں اپنی روایات اقدار اپنی تہذیب و تمدن کو زندہ رکھنے سے سرگرداں رہے اور اپنی اولاد (وقار، عبداللہ اور یوسف) کو بھی اپنی خاندانی روایات کی اخلاقی اور ذہنی ثروت کی توانیاں عطا کر کے انکی بہترین تعلیم و تربیت کرنے کا فریضہ بخوبی انجام دیتے رہے۔

علیم بھائی کو جہاں اپنی مشرقی تہذیب وتمدن سے بے پناہ لگاؤ تھا وہاں آپ کواردو زبان سے بے پناہ عشق بھی تھا۔ لکھنؤ جواردو زبان کا مخرج اور مآخذ کا درجہ رکھتا ہے وہیں سے یہ اردو زبان چاردانگ عالم میں پھیلی ہے مگرافسوس صد افسوس کہ اب خود لکھنؤ میں یہ زبان کسی لسانی سازش کے تحت نیست ونابود ہوتی جارہی ہے۔آپ کواردو زبان کی زبوں حالی کا دل سے قلق تھا۔ علیم بھائی اکثر ہی اپنے عزیز واقارب اوراپنے حلقۂ یاراں میں اردو زبان کوزندہ رکھنے کی نصیحتیں کرتے نظرآتے۔ وہ سب کوسمجھاتے کہ اپنے بچوں، اپنی آئندہ آنے والی نسلوں کوضرور عربی، ہندی، انگریزی زبانیں سکھاؤ مگرخداراا پنے اسلام کی اس خوبصورت ورثے کی بھی حفاظت کرواس اردو زبان کوضرورسیکھواورسکھاؤ۔

علیم بھائی اردو زبان پر مضبوط گرفت رکھنے کے ساتھ اسکی لطافتوں اورنزاکتوں سے پوری طرح باخبر تھےاورآپ یہ بھی جانتے تھے کہ عربی زبان کے بعد مذہب اسلام کے تمام اسلامی کتب کا ذخیرہ صرف اردو زبان ہی میں موجود ہے۔بہشتی زیور، قرآن پاک کی مفصل تفاسیر اور احادیث کی شروحات سب سے زیادہ اردو زبان میں موجود ہیں۔یعنی اپنے آفاقی مذہب (اسلام) کوسمجھنے اوراس پرعمل پیرا ہونے کیلئے اردو پڑھنالازمی ہونا چاہیے۔آپکی دانشمندفکراورمخلص لگن یہ جانتی تھی کہ اردو زبان سے دوری ہندوستان میں آئندہ آنے والی نسل کو مذہب سے دور کرنے کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔

علیم بھائی کی معرکہ الاراءنظم ''اردو زبان''اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ اردو سے آپکوکتنی محبت تھی اوراس محبت کے حق کووہ ان الفاظ میں ادا کرتے ہوئےنظرآئے۔

گلفام کی گلنار کی تسکین ہے اردو
مغموم ہے مظلوم ہے مسکین ہے اردو

گنگا کی یہ گودی میں پلی اور پڑھی ہے
جمنا کی یہ بانہوں میں ہمیشہ سے رہی ہے
غیروں سے شکایت نہیں اپنوں سے گلہ ہے
بے تاب ہے بے چین ہے غمگین ہے اردو

اردو کی محبت وانسیت ہی انھیں کھینچ کھینچ کر ادبی محافل کی زینت بنائی تھی جدہ کی ادبی تقریبات میں آپ کی شمولیت شرکت باعث صد افتخار سمجھی جاتی تھی۔ انکی ادبی دلچسپی کی وجہ سے اہل ادب وسخن آپ کو قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

علیم بھائی مرحوم علم وفن، شعر وادب اور تحقیق وتنقید کے کاموں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے میرے شوہر محسن رضی علوی سے بھی انکی بے پناہ محبت وخلوص کا اک خصوصی تعلق بھی یہی شعر وادب میں بے انتہاء لگاؤ تھا کیونکہ میرے شوہر جدہ کے معروف شاعر ہیں اور اکثر وبیشتر علیم بھائی مرحوم سے انکی ملاقاتیں ادبی تقریبات میں ہوتی تھیں۔

آجکل کا مادہ پرست دور جہاں اکثریت نے اپنی زندگی کا محور دولت وشہرت کو بنا کر زندگی گزارنے کے نئے نئے ڈھب سیکھ لیئے ہیں انکے درمیان علیم بھائی مرحوم خودداری وضع داری، شرافت، نیک نامی، خاندانی وقار کی ایک مکمل تصویر تھے۔ علیم بھائی مذہب اسلام کے سچے پیروکار، حضرت محمد المصطفی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سچے گرم جوش عاشقوں میں سے تھے۔ مذہبی عقائد میں پکے راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کی وجہ سے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ حلال روزی پر زور دیا۔ آپ نے کسبِ حلال کے لیے دنیا کی دولت کو ٹھکرا دیا ہمیشہ حرام اور سود کے دلدل میں جانے سے پرہیز کیا رزقِ حلال کی جائز طلب نے آپ کو زندگی کے نشیب وفراز بہت قریب سے دیکھائے۔ مگر آپ نے اپنے مضبوط ارادے، بلند ہمتی، عزم واستقلال کا لوہا منوالیا اور زندگی کی

آخری منزل تک اپنی اولاد اور آئندہ آنے والی نسلوں کیلئے روشن مینار بنے رہے۔

علیم بھائی عزم و صداقت کے علمبرداروں میں سے ہیں۔ انکی سادہ صاف گو مزاج بہترین اخلاق، عزم وحوصلہ انشاء اللہ تعالیٰ جنت الفردوس کا حقدار بنا دے گا، ہمدردی، رحمدلی، غمگساری، غمخواری کے جذبات سے موجزن علیم بھائی کا دل رہتا اور اپنے سگے، غیر کے مسائل کا حل ڈھونڈنے کیلئے بیقرار رہتا تھا۔ لہجہ کا دھیما پن ہونٹوں پر پھیلی مدہم مسکراہٹ جو آپکے خدوخال کا حصہ ہی معلوم دیتی پر اپنے اور غیر کے لیے اپنائیت کا پیغام دیتی نظر آتی تھی۔

مزاج کی شگفتگی، بذلہ سنجی، بات بات پر چٹکلے چھوڑنے کی شگفتہ مزاجی محفلوں کو کشت زعفران بنا دیا کرتی تھی۔ آپ سے ملاقاتوں کے دوران میں نے ایک بات خصوصیت سے محسوس کی تھی کہ وہ صرف ہمارے لیے عزیز ہیں بلکہ اپنے ہر ملنے والا سے اس خلوص ومحبت سے ملتے تھے کہ ہر ایک یہی سمجھتا تھا کہ وہ ہم کو سب سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ عزیز واقارب دوست واحباب محلے والے ملنے والے غرض یہ کہ انکے گھر آنے والے کے لیے ان کے دل کے دروازے ہمیشہ ہر لمحے اور ہر پل سب کیلئے کھلے رہتے۔ بقول شاعر

ہر ایک کو تھا گماں کہ مخاطب ہم ہی سے تھے

موت کا دستور ہے کہ وہ ان لوگوں کو مکمل طور پر ختم کر دیتی ہے جن کا کوئی نام ونشان نہ ہو مگر علیم بھائی اپنی گوناگوں عظیم خصوصیات، اپنے روشن اعمال اور اپنے تینوں ہونہار سپوتوں کی بہترین تعلیم وتربیت کی وجہ سے ایک عظیم تر مثالی انسان کی حیثیت سے ہمیشہ ہم سب کے دلوں میں زندہ جاوید رہیں گے۔

علیم احمد صدیقی۔ چند تاثرات

''وہ اپنے تہذیبی طرز و انداز اور اپنے ادبی ذوق کے ساتھ پہچانے گئے۔ ان کی طبیعت میں ادب نوازی اور شعری ذوق رچا بسا تھا۔''

حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی صاحب، ناظم ندوۃ العلماء (لکھنؤ)

''علیم کا ادبی ذوق بے حد عمدہ تھا۔''

جناب نیر مسعود صاحب (لکھنؤ)

''ملت اسلامیہ کے ایک خادم اور بہی خواہ اور اردو دنیا میں بچوں اور بڑوں کے ایک ہر دل عزیز ادیب، خوش گو شاعر مقالہ نگار اور کہانی کار کی حیثیت سے ایک نمایاں مقام حاصل کر چکے تھے''

جناب حسین امین صاحب (لکھنؤ)

''علیم بچپن ہی سے لکھنوی ادب و تہذیب کے علمبردار رہے۔''

ڈاکٹر محمد عبدالحفیظ صدیقی صاحب (پونہ)

''بات میں بات پیدا کرنا، برمحل برجستہ اشعار سنانا ہر محفل میں خوش دلی آمادگی اور جوش و خروش سے شریک ہونا اور اپنی گل افشانیٔ گفتار سے محفل کو زعفران زار بنا دیا۔''

جناب شریف اسلم صاحب (جدہ)

''علیم صدیقی مرحوم نے اپنی خداداد صلاحیتوں کا مناسب استعمال نہیں کیا۔ نثر لکھنے میں انہوں نے اپنی قابلیت و علمیت کا خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا اور نہ ہی سنجیدگی سے بھی اس طرف توجہ دی جلسوں اور تقاریب کے لئے وہ وقتی ضرورت کے تحت قلم برداشتہ جو لکھنا ہوتا لکھ ڈالتے''

جناب رشید انصاری صاحب (حیدر آباد)

''علیم بھائی مرحوم علم و فن، شعر و ادب اور تحقیق و تنقید کے کاموں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے''

محترمہ تبسم محسن علوی صاحبہ (جدہ)

''آپ حقیقت میں اسلامی تہذیب اور لکھنوی ادب کے سچے مگر گمنام علمبردار تھے۔''

جناب محمد عبداللہ صدیقی صاحب (جدہ)